نمبردار کا نیلا

ایک جانور کی کہانی، اُس کی پرورش انسانوں نے کی تھی
ہمارے عہد کے ایک مُنفرد اور ممتاز کہانی کار
سید مُحمد اشرف کی ایک تحریر

ہَوا بالکل خاموش تھی۔ ارہر کا لمبا چوڑا کھیت گھیرے میں لیے پچاس ساٹھ آدمیوں کی موجودی کے باوجود غضب کا سناٹا تھا۔ پاگل نیلا اسی کھیت میں کسی جگہ موجود تھا۔ لاٹھیاں، ڈنڈے اور سانٹھیں تھامے وہ سارے آدمی پنجوں کے بل چل رہے تھے اور پھونک پھونک کر قدم اُٹھا رہے تھے۔ اگر کھڑی فصل میں سے نمودار ہو کر، اپنے نکیلے سینگ پر رکھ کر ریلتا ہوا، پٹخنیاں دیتا ہوا، کھروں سے کھوندتا ہوا، لہولہان کرتا ہوا وہ بھاگا تو کیا ہوگا۔ یہی سوچ ہر آدمی کے کانوں میں دھڑکن بن کر دھک دھک کر رہی تھی۔

اچانک ہَوا چلی، ارہر کے پودوں کی شاخیں آپس میں ٹکرا کر بجیں اور ہر آدمی کو وہ آواز نیلے کی بھگدڑ کی طرح محسوس ہوئی اور ہر آدمی کے منہ سے ڈری ڈری سی چیخ نکل پڑی۔ جب کسی کے پاس بھی پودے چیرتا ہوا نیلا نہیں نکلا تو سب کی جان میں جان آئی۔ طے یہ ہوا تھا کہ سب کے سب گھیرابندی اس طرح کریں گے کہ ایک آدمی سے دوسرے آدمی کا فاصلہ ایک لاٹھی کی لمبائی سے زیادہ نہ ہو تاکہ اگر نیلا اچانک اندر سے حملہ کرے تو ہر آدمی کے پاس ایک لاٹھی کے فاصلے پر کم از کم دو بچانے والے موجود ہوں۔ دائرے میں چلتے چلتے اگر ایک دوسرے کے درمیان فاصلہ زیادہ ہو جاتا تو دل دھڑکنے لگتا اور وہ فوراً رفتار کچھ تیز کر کے یا دھیمی کر کے فاصلہ ایک لاٹھی کے برابر کر لیتے جیسے عید کی نماز میں کن انکھیوں سے صفیں دُرست کی جاتی ہیں۔ گرمی اور خوف کے مارے سب کے ہاتھ لاٹھیوں پر پسیجنے لگے تھے۔ نتھو چچا نے کھوج دیکھ کر بتایا تھا کہ کھیت میں جانے کے کھوج تو ہیں، باہر نکلنے کے نہیں۔

نیلا یقیناً کھیت کے اندر تھا۔ نیلا یا تو بیٹھا تھا یا ساکت کھڑا تھا لیکن وہ اپنی دُم اتنی دیر تک بے حرکت نہیں رکھ سکتا۔ دُم ہلتی تو ارہر کے کسی پودے سے ضرور ٹکراتی، ٹکراتی تو آواز ہوتی لیکن کھیت کے اندر کوئی آواز نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا، وہ کھیت کے اندر ایک ایسا محفوظ گوشہ تلاش کر کے بیٹھا ہے جہاں فصل ماری گئی ہے اور پودے برائے نام ہیں۔ کھیت میں فصل کہاں کہاں ماری گئی ہے، یہ بات نمبردار اُودَل سنگھ اور ان کے نوکروں کو معلوم تھی لیکن وہ کسی بھی سوال کا صحیح، براہِ راست اور فطری جواب نہیں دے رہے تھے۔ وہ صحیح جواب اس لیے بھی نہیں دے رہے تھے کہ وہ اس مہم میں براہِ راست فریق بن کر سامنے آنا نہیں چاہ رہے تھے۔ بستی کی آبادی کے دباؤ میں وہ بہ مشکل اس بات پر راضی ہوئے تھے کہ ہانکا کر کے، نیلا نکال کر اسے صرف اتنا مارا جائے کہ وہ باڑے میں بند کیا جا سکے۔ پچاس ساٹھ جوانوں کی تعداد کافی تھی، اگر وہ فصل کے اندر داخل ہونے کی اجازت دے دیتے۔ طریقہ بھی یہی ہوتا ہے کہ جنگلی جانور اگر کسی فصل کے اندر چھپا ہو تو چاروں طرف سے گھیر کر کچھ لوگوں کو فصل کے اندر داخل کر دیتے ہیں جو شور مچا مچا کر جانور کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور جانور باہر نکلتے ہی داب لیا جاتا ہے۔

ٹھاکر اُودَل سنگھ کا خیال تھا کہ اس طرح فصل کے اندر داخل ہونے سے فصل برباد ہو گی اور ساتھ ہی ساتھ تلسی کے پودے بھی پیروں تلے روندے جائیں گے جن سے ان کی بے حرمتی ہو گی۔ لوگوں نے پوچھا، ارہر کے کھیت میں تلسی کے پودے کہاں سے آئے۔ ٹھاکر نے جواب دیا کہ یہ دراصل تلسی ہی کا کھیت تھا، ارہر تو کسی مجبوری کی وجہ سے اگانی پڑی۔ لوگوں نے کہا کہ اتنے بڑے کھیت میں تلسی کی کاشت کے کیا معنی، تلسی تو گملوں میں بھی اگائی جا سکتی ہے کہ اس کا مصرف ہی کتنا ہے۔ کبھی کبھی نزلے زکام میں پتیاں اُبال کر پی لیں یا کبھی کبھی پوجا کر لی۔ ٹھاکر اُودَل سنگھ نے جواب دیا کہ تلسی کی فصل کا صرف اتنا کام نہیں ہے۔ جب تلسی بڑھتی ہے تو اس کی پتیوں میں سورج کی تیز چمک سے ایک خاص مادّہ پیدا ہوتا ہے، اس مادّے میں ایک خوش بو ہوتی ہے، ہَوا چلے تو وہ خوش بو دُور دُور

سیّد محمّد اشرف، اُردو کے ایک تازہ خیال، عجوبہ کار انشا پرداز، اپنی طرز، اپنے رنگ کے فسانہ نگار۔ ھائی اسکول کی سند کے مطابق پیدایش 8 جولائی 1957، وطنِ مالوف، مارہرہ، وطنِ مولود، سیتاپور، حضرت سیّد شاہ حَسن میاں قادری کے فرزندِ ارجمند، خانقاہِ برکاتیہ کے مکتب اور مارہرہ کے مختلف اسکولوں میں ابتدائی تعلیم، علی گڑھ مُسلم یونی ورسٹی سے بی اے آنرز اور ایم اے۔ دونوں میں اوّل درجہ اور اوّل حیثیت۔ اس فضیلت پر یونی ورسٹی سے دو تولے سونے کا انعام، یونی ورسٹی کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش، انجمن اُردوئے معلّی کے سیکریٹری، یونی ورسٹی لٹریری کلب کے دو سال تک سیکریٹری اور یونی ورسٹی کے مجلّے 'علیگ' کی ادارت میں شامل۔ خاندانی ماحول علمی اور مذہبی، ہندوستان میں قادریہ سلسلے کی سب سے بڑی خانقاہ، خانقاہِ برکاتیہ سے تعلّق۔ اجداد میں حضرت سیّد شاہ برکت اللہ پیمی ہندی زبان و ادب کے اوّلین معماروں میں شمار ہوتے تھے۔ شاہ جہاں کے عہد میں اُن کے تخلیق کیے ہوئے مجموعۂ کلام 'پیم پرکاش' پر ڈاکٹریٹ ہوچکی ہے۔ جدِ مکرّم حضرت سیّد شاہ آلِ عبا (حضرت آوارہ) نے اردو تہذیب کے قابلِ قدر مرقّعے قلم بند کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔

سیّد محمّد اشرف نے بھی اپنے خاندان کی روایت برقرار رکھی۔ 1970 سے یعنی 14 سال کی عمر میں باقاعدہ لکھنا شروع کیا اور ایک ہجوم متاثر کیا۔ سُنتے ہیں، تخلیقی جوہر کی علامتیں ابتدا ہی میں ظاہر ہوجاتی ہیں۔ علمی و ادبی حلقوں کی طرف سے اُن کے ادبی سفر کے آغاز کی ایک کہانی 'ڈار سے بچھڑے' کی پزیرائی خوب تھی۔ یہ تپاک چند ہی خوش بختوں کو ملتا ہے۔ اچھا شعر اپنے سامع خود ڈھونڈ لیتا ہے۔ ہر نئی اور اچھی بات کے پَر لگے ہوتے ہیں اور وہ جو کہتے ہیں، اچھے شعر کو سفارش کی ضرورت نہیں ہوتی، اچھی تحریر آپ اپنا تعارف ہوتی ہے۔ بس نئے سے نئے، اچھے سے اچھے کی کوشش کرتے جائیے اور باقی معاملات سننے والوں، پڑھنے والوں اور دیکھنے والوں پر چھوڑ دیجیے وہ ہر اچھوتی، انوکھی، خیال انگیز چیز کی جستجو میں رہتے ہیں۔ دبستانِ افسانہ میں سیّد محمّد اشرف کے خوش آیند اضافے پر مختلف ادبی رسائل میں گفتگو ہونے لگی۔ کسی نے انہیں سیّد رفیق حُسین دوم کا خطاب دیا، کسی نے کہا کہ ایک نیا ابوالفضل صدّیقی پیدا ہوگیا ہے۔ کسی نے ان دونوں کا مرکّب قرار دیا اور کسی نے کہا کہ دونوں یادگار فسانہ نگاروں کے منفرد تخلیقی کام کو سیّد محمّد اشرف نے ایک

تک جاتی ہے۔ جہاں جہاں تک خوش بو پہنچتی ہے، وہاں وہاں تک دیگر فصلوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑے مار دیتی ہے۔

لوگوں نے کہا، ہم نے تو ایسا نہیں سنا۔ نمبر دار اُودَل سنگھ نے کہا کہ اس کے ذمّے دار وہ نہیں ہیں۔ تب لوگوں نے کہا، مگر تلسی کے پودے نظر تو نہیں آرہے۔ ٹھاکر اُودَل سنگھ نے جواب دیا، ممکن ہے اندر ہوں، اندر جاکر میرے سوا تو کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا، زیادہ تر تو ارہر ہی کے پودے ہیں بلکہ ہماری نظر میں تو صرف ارہر کے پودے ہیں۔ ٹھاکر اُودَل سنگھ نے کڑک دار آواز میں کہا، نظر دھوکا بھی کھا سکتی ہے۔ اگر اسی دھوکے میں ارہر کی فصل کے ساتھ تلسی کے پودے بھی کچل گئے تو ذمے دار کون ہوگا، بولو ذمے دار کون ہوگا۔ بولو، چپ کیوں ہوگئے؟ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور آہستہ آہستہ سب نے خود کو یقین دلایا کہ ارہر کے بڑے کھیت میں یقیناً زیادہ تر تلسی ہی کے پودے ہیں اور تلسی کے پودے کچل جائیں تو شراپ لگے گا۔ دراصل اندر جانے کا خطرہ بھی کوئی مول لینا نہیں چاہ رہا تھا۔ اندر جانے کا مطلب تھا، نیلے سے پہلا، براہِ راست اور دُوبدو مقابلہ، جہاں بھاگنے کی بھی جگہ کا امکان نہیں تھا۔ وہ لوگ دائرے میں چلتے رہے۔ بِھیجی ہوئی لاٹھیاں تھامے، برابر کا فاصلہ رکھتے ہوئے۔ اپنی سانسوں کی آواز سنتے ہوئے، کھیت کی موہوم سی موہوم آواز پر کان رکھے ہوئے۔

ہَوا چلی، شاخیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ پورے کھیت میں ہَوا کے بہاؤ کے رخ پر آوازوں کا ریلا آگے بڑھا۔ ان آوازوں کو لوگوں نے پھر نیلے کی بھگدڑ سمجھا۔ پھر سب کے منہ سے ڈری ڈری چیخیں نکلیں۔ ایک دوسرے کو چیختا سن کر لوگوں کی چیخیں اور طویل ہوگئیں۔

ایک نسبتہً کم گھنے حصّے میں ساکت منوں وزنی گوشت کا سیاہ تودہ کنوتیاں ملائے کھڑا تھا۔ دُم تیزی سے بے آواز گردش کررہی تھی۔ ہری خوراک کے پودوں کے اُدھر چاروں طرف دیر سے ہلچل سنائی دے رہی تھی مگر کھیت کے اندر کوئی آواز نہیں تھی۔ کھیت محفوظ تھا۔ ہَوا کے جھونکوں سے پودے بجے تو وہ آواز اس کی مانوس آواز تھی لیکن ان آوازوں کے بعد اچانک آدمی بھی چیخے تھے اور ایسا دوسری بار ہوا تھا اور اس بار ابھی تک چیخیں تھمی نہیں تھیں۔ اسے لگا، جیسے یہ چیخیں چاروں طرف سے بلند ہورہی ہیں۔ اسے لگا، گھیرا تنگ ہورہا ہے۔ اسے لگا، لوگ اس کے بالکل نزدیک ہوگئے ہیں۔ اس کی دُم نے تیزی

نئی جہت دی ہے۔ صورت یہ ہے کہ سیّد صاحب موصوف کی بیش تر کہانیوں کے کردار ابوالفضل صدّیقی اور رفیق حُسین کی طرح جانور ہیں لیکن یہ جانور ابوالفضل صدّیقی اور رفیق حسین کے جانوروں سے مختلف ہیں، اس فرق کا ذکر پروفیسر نیّر مسعود ایک ادبی بحث میں تفصیل سے کرچکے ہیں اور قاضی عبدالستّار نے بھی شدّومد سے اس مشابہت و مماثلت سے اختلاف کیا ہے۔ قاضی صاحب قبلہ کہتے ہیں کہ وہ معصوم خواتین و حضرات جو سیّد محمّد اشرف کی کہانیوں کو صدّیقی اور حُسین کا چربہ کہتے ہیں، انہوں نے یا تو صدّیقی اور حُسین کو پڑھا نہیں ہے یا اشرف کو سمجھنے میں بُخل کیا ہے۔ قاضی عبدالستّار کے مطابق، صدّیقی کی زبان قدیم اور ثقیل ہے، جزئیات کی کھتونی اور تفصیلات کا کھلیان ان کی خصوصیات بھی ہیں اور کم زوری بھی۔ صدّیقی وہ سب کچھ لکھ ڈالتے ہیں جو نہیں لکھنا چاہیے۔ رفیق حُسین کی طُول طویل کہانیوں میں جانور آخر تک محض جانور رہتا ہے جب کہ اشرف کے جانور انسانوں پر اس طرح غالب آجاتے ہیں کہ انسان جانور معلوم ہونے لگتے ہیں۔ دونوں بزرگ افسانہ نگار یہ تو جانتے ہیں کہ کیا لکھنا ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ کیا نہیں لکھنا ہے۔ افسانہ، چاول پر قل ہواللہ لکھنے کا فن ہے۔ یہ صرف بڑا افسانہ نگار جانتا ہے کہ اُسے کیا نہیں لکھنا ہے۔ بڑا اور اچھا افسانہ محض افسانہ نہیں ہوتا، فکر و دانش کی دولت سے بھی مالامال ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کو زبان پر قدرت نہیں تو مہارت ضرور ہونی چاہیے۔ اشرف کو یہ مہارت حاصل ہوچکی ہے۔ قاضی صاحب کہتے ہیں۔ "زوال کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ بڑے الفاظ کے معنی چھوٹے ہوجاتے ہیں۔ لفظ 'جدید' کے معنی بھی پیشہ ور حروف فروشوں نے پینسٹھ پینسٹھ برس کے بوڑھے اور کم مایہ افسانہ نویسوں کے لیے استعمال کرکے چھوٹے کردیے، مہمل کردیے۔ سیّد محمّد اشرف نہ سکّہ بند جدید ہے نہ لکیر کا فقیر ترقّی پسند۔ یہ ایک کھرا اور معتبر افسانہ نگار ہے۔ اُس نے اپنے اِردگرد موجود ہنستی روتی زندگی کے سُرخ و سفید و سیاہ رنگوں سے اپنا نگارخانہ سجایا ہے۔"

اور مسلّمہ طور پر جدید اُردو افسانے کی میرکارواں محترمہ و مکرّمہ قرۃ العین کا فرمودہ ہے۔ "ابوالفضل صدّیقی اور سیّد رفیق حُسین کے جنگلوں سے نکل کر ایک پگ ڈنڈی سیّد محمّد اشرف کے ہول ناک جانورستان تک آن پہنچی ہے جس میں انسان اور لکڑ بھگے اور پاگل ہاتھی متبادل حیثیتیں رکھتے ہیں۔" عینی کہتی ہیں۔ "اس

سے گردش کاٹی اور اگلے کھُر مٹّی میں مارے۔

باہر لوگوں نے محسوس کیا۔ ان کی سہمی سہمی چیخیں جیسے ہی بند ہوئیں، اندر کھیت میں زوردار آوازیں پیدا ہوئیں، اڑڑ۔۔ بھرڑڑر۔۔اڑڑر بھرڑڑر۔۔ کرتا ہوا نیلا، ارہر کے مضبوط پودوں سے ٹکراتا ہوا پوری رفتار سے ایک طرف برآمد ہوا۔ ڈری ڈری چیخیں بلند ہوئیں۔ کچھ لوگوں کے ہاتھوں سے لاٹھیاں چھوٹ گئیں۔ کچھ اندھادھند دوسری طرف بھاگے۔ کچھ نے ہمّت کرکے لاٹھیاں بلند کرکے وار کیے۔ خون میں لہولہان سیاہ نیلا کھیت اور فصلیں پار کرتا ہوا سیدھا آبادی کی طرف دوڑا۔

ٹھاکر اُودَل سنگھ نے نیلے کو اس کے بچپن سے پالا تھا۔ اس کے پالنے کی وجہ بھی عجیب و غریب تھی اور اس پر ابھی تک بھید کے پردے پڑے ہیں۔ اُودَل سنگھ بہ یک وقت دیہات، قصبے اور شہر کے باشندے تھے۔ تینوں جگہ ان کے مکانات تھے۔ گاؤں میں آبائی کھیت تھے، قصبے میں چیئرمینی اور شہر میں تجارت۔ وہ حکومت، تجارت اور سیاست تینوں کو برابر کا وقت اور اہمیّت دیتے تھے۔ گاؤں میں گڑھی تھی، قصبے میں حویلی اور شہر میں کوٹھی۔

ایک دن گاؤں کی گڑھی میں چوری ہوگئی۔ پچاس تولے سونا، بیس سیر چاندی کے برتن اور دس ہزار روپے کے علاوہ گروی گانٹھ کے تیس چالیس سونے کے عدد بھی گئے۔ وہ قصبے سے اپنی جیپ میں طوفانی رفتار سے گاؤں پہنچے اور گڑھی کے دیہاتی پہرے داروں کے سر پہ اتنے جوتے بجوائے کہ ڈاکٹری معائنے کی ضرورت پیش آگئی۔ ان لوگوں نے روتے روتے اعتراف کیا کہ رات دوسرے گاؤں کی برات میں کچھ لوگ آئے تھے، انہوں نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر بیڑیاں پیں اور ہمیں اپنی سگریٹیں پلائیں، سگریٹیں پی کر ہم بے ہوش ہوگئے۔ گڑھی کے پیچھے پہرے کے کتّے مُردہ پائے گئے، ان کے منہ سے نیلا نیلا پانی رِس رہا تھا۔ انہیں گوشت کے پارچوں میں کھلا دیا گیا تھا۔

جس دیہات سے برات آئی تھی وہاں دوِش دی گئی تو برات کے گھرانے نے ان سگریٹ پلانے والوں سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، بتایا کہ ہم تو ان کو براتی سمجھے تھے، خیال کیا تھا کہ لڑکی والوں کے دور کے رشتے دار ہیں جو کسی اور بستی سے بیاہ کے نیوتے میں آئے ہیں۔

ٹھاکر اُودَل سنگھ دانت پیس کر رہ گئے۔ وہ رات کا بے چینی

صدی کے اختتام پر ایک سفّاک، بے حِس، بے عِلم، جرائم پیشہ دنیا ظہور میں آچکی ہے۔ انسانوں کی کایا کلپ ہورہی ہے۔ جب بھی اس نئی دنیا کی 'پنچ تنتر' لکھی گئی، سیّد محمّد اشرف کی چند کہانیاں اس میں ضرور جگہ پائیں گی۔" قاضی صاحب اور محترمہ عینی ہی نہیں اور بھی نام وَر، عصمت چغتائی، خواجہ احمدعبّاس، شمس الرّحمان فاروقی، گوپی چند نارنگ، شمیمِ حنفی، فضیل جعفری، مہدی جعفر، شمس الحق عثمانی، انور خاں وغیرہ سیّد محمّد اشرف کے فن پر اظہار خیال کرچکے ہیں۔

ادب و شعر کے اس خارزار میں روز نئے سخن وَر طلوع ہوتے ہیں' کسی کی آمد کی آہٹ ہی نہیں ہوتی، دریا میں دوچار پتّھر پھینکنے جیسا ارتعاش ہوتا ہے اور بس، کوئی آتے ہی تلاطم برپا کردیتا ہے۔ کسی کی آواز جلد ہی ٹمٹمانے لگتی ہے، کسی کی آواز اپنی روشنی کا دائرہ مسلسل پھیلاتی رہتی ہے۔ کبھی اس آواز کے سوا کچھ دکھائی سنائی نہیں دیتا۔ کسی کی آواز اُس کے روپوش ہوجانے کے بعد بھی گونجتی رہتی ہے۔ صدیوں تک اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ساری بات تو آواز کی توانائی کی ہے۔

ناقدوں نے سیّد محمّد اشرف کے لیے بڑے امکانات اور اُمیدوں کا اظہار کیا ہے۔ بساطِ ادب میں ہر نووارد کا استقبال شریف النّفس ناقدینِ کرام ایسی خوش دِلی سے نہیں کرتے۔ اُن کے اس لُطف و کرم کے لیے فکر و خیال کی تازگی اور لہجہ و لب کی توانائی لازم ہے مگر یہ تماشا بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ اعلا ترین القاب و خطابات کی نوازش کرنے والے یہ ناقدین اپنے ممدوح تازہ کار کے راستے منتشر کردینے کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ پھر وہ انھی میں سُرخ رُو ہونے، انھی کی خوشنودی کی تگ و دَو میں عامتہ النّاس سے دُور ہوتا چلا جاتا ہے اور کبھی کبھی تو صرف ناقدوں کا رہ جاتا ہے۔ ایک ادیب کو، مدّعا محدود کیجیے تو ایک افسانہ نگار کو اس واقعے کا عرفان ہونا چاہیے کہ ناقدوں کو اُس کی تخلیقی کرشمہ سازی اور معرکہ آرائی کی اتنی ضرورت نہیں جتنی عام قارئین کو ہے۔ یہ عام قاری بھی اچّھی اور گہری نظر رکھتے ہیں۔ ہر تخلیق کے تین مخاطب ہوتے ہیں، عوام، خواص اور عوام و خواص۔ عوام و خواص پر یکساں طور سے اثرانداز ہونے والی تخلیقات کا شمار بھی کم نہیں ہے۔ علامتی کہانیاں تراشتے تراشتے نیّر مسعود "طاؤس چمن کی مینا" لکھتے ہیں تو سبھی خاص و عام کورنش بجا لاتے ہیں۔ جناب سیّد محمّد اشرف

سے انتظار کرنے لگے۔ جب رات ہوئی اور دیہات میں رات شام کے بعد ہو جاتی ہے تو انہوں نے گڑھی کے دروازے بند کرا کے تیسرے دالان کے پیچھے والے کوٹھے میں جا کر اوپر جانے والی سیڑھیوں میں سیڑھی نمبر تین کا پٹیا ہٹا کر معائنہ کیا اور اطمینان کیا کہ ڈالڈا کے تینوں ڈبّوں میں سونے کے وہ سارے زیور ویسے کے ویسے موجود ہیں جو اُدھار لینے والوں نے ضمانت کے طور پر رکھوائے تھے اور جو سُود ادا نہ کرنے کے تاوان میں ڈوب گئے تھے اور ٹھاکر اُودَل سنگھ کی دولت کے سمندر میں ابھر آئے تھے۔ وہ لگ بھگ گیارہ سیر سونے کے زیور تھے۔ یہ خزانہ شہر کی کوٹھی میں رکھنے کا مطلب انکم ٹیکس والوں کے خوف سے خود کو بے خواب رکھنا۔ قصبے کی حویلی میں جو خفیہ جگہ بنوائی تھی اور جسے بنانے والے راج مستری کے کپڑے تعمیر کے دوسرے دن نہر کنارے پائے گئے تھے، وہ اُس نقدی کے لیے ناکافی تھی جو ٹھاکر اُودَل سنگھ نے شہر کے کولڈ اسٹوریج اور قصبے کی چیئرمینی سے پیدا کی تھی۔ کولڈ اسٹوریج میں نوّے فی صد آلو ان کا خریدا ہوا تھا لیکن حساب کی کتابوں میں اس کا اندراج دیہات کے کسانوں کے نام ہوتا تھا۔ ایک بار انکم ٹیکس افسر نے ان کسانوں کو نوٹس بھیج کر شہر کے آفس میں بلا کر چیلنج بھی کیا تھا۔ کسانوں نے سارے اندراجات اپنے نام میں قبول کیے۔ یہ سارے کسان وہ تھے جو ٹھاکر اُودَل سنگھ کی گڑھی سے برسات اور سردیوں میں اپنے گھر کے زیور رکھ کر قرضہ اُٹھاتے تھے۔ جس دن کسانوں کے بیانات ہوئے تھے، اس سے دو دن پہلے ٹھاکر صاحب شہر کے وکیل کو لے کر گڑھی میں آئے تھے اور ان سارے کسانوں کو آنگن میں بٹھا کر سوال جواب کی تیاری کرا دی تھی اور لال اور نیلی رسیدوں والی کتابیں دکھا کر ان سے پوچھا تھا۔ "کیا تم یہ رسیدیں پہچانتے ہو؟"

"نہیں۔" سب نے ایک آواز ہو کر کہا تھا۔

شہر کا وکیل ٹھاکر صاحب کا چہرہ دیکھنے لگا اور جلدی جلدی سگریٹ پینے لگا۔ ٹھاکر صاحب نے دانت پیس کر سمجھایا کہ تم سب یہ کتابیں پہچانتے ہو کیوں کہ ان پر تمہارے انگوٹھوں کے نشان ہیں۔ پھر انہوں نے سب کے انگوٹھوں کے نشان لگوائے۔

انکم ٹیکس دفتر میں کسانوں نے بہ یک آواز بتایا کہ "ہم ان کتابوں کو پہچانتے ہیں اور کولڈ اسٹوریج میں سارا آلو ہمارا ہی ہے، ان کتابوں کو کھتّے کہتے ہیں اور ان پر ہمارے انگوٹھوں کے نشان ہیں۔"

انکم ٹیکس افسر یہ سُن کر چکرا گیا۔ اس نے اپنے انسپکٹر کو

سے اُن کا کوئی سادہ شعار طلب گار' اُن کا کوئی شیدائی یہی عرض کرسکتا ہے کہ عالی مرتبت ادیبوں اور ناقدوں کی اوٹ میں کہیں وہ اُن کی نظروں سے اوجھل نہ ہوجائے۔ کہانی کی اُسے بہت ضرورت ہے۔ کہانی کا یہاں بڑا کال ہے۔

فکر و دانش کی بات اپنی جگہ، موضوع سے انصاف، کردار سازی میں مہارت، ندرتِ بیاں اور قدرتِ اظہار اور چاول پر قُل نقش کرنے کی مشتاقی کی خوبیاں تسلیم لیکن اصل بات تو کہانی کہنا ہے۔

'نمبردار کا نیلا' دیکھیے اور سیّد محمّد اشرف کے لیے دعائے خیر کیجیے۔

ہاں ایک اور بات، اچّھا تھا کہ 'نمبردار کا نیلا' کے ساتھ اس کے خالق سیّد محمّد اشرف کے احوال و کوائف پر مشتمل چند سطور بھی شائع ہوجاتیں لیکن اتّفاق ہے، ان کی دست یابی ایک مشکل مرحلہ ہوگئی۔ یہ بھی ایک داستان ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے سیّد صاحب کے افسانوی مجموعے 'ڈار سے بچھڑے' پر قاضی عبدالستّار اور قرۃ العین کے تبصرے توکندہ تھے، سیّد صاحب کا شخصی تعارف مندرج نہیں تھا برادرِ محترم جناب آصف فرّخی کے دیے ہوئے نمبروں پر متعدّد بار فون کیا گیا، گھنٹیاں بجتی رہیں۔ پھر ممبئی میں اپنے مربّی و محبّی گل زار کو زحمت دی۔ وہ بھی ناکام ہوگئے۔ برادرم آصف فرّخی نے دوسری مرتبہ سیّد صاحب کے ایک شناسا کا حوالہ اور سیّد صاحب کا اقامتی پتہ مرحمت فرمایا۔ یہ تفصیل بذریعۂ ای میل گل زار صاحب کو منتقل کردی گئی اور آخر بعدازکوششِ بسیار اور حجّتِ تمام گل زار صاحب، سیّد صاحب موصوف سے رابطہ کرنے میں کام یاب ہوگئے، دوسرے دن ہمیں سیّد صاحب کا 'بہ قلم خود خاکہ' فیکس کے ذریعے موصول ہوگیا۔ ممنونیت کا اظہار رسمی ہے لیکن جناب آصف فرّخی اور جناب گل زار کی اعانت کے بغیر یہ سطور کس طرح ممکن ہوتیں۔

مدیر

دوسرے کمرے سے بلایا۔ انسپکٹر نے اسے پھر سمجھایا کہ "سر! میں خود کئی دنوں تک کسان کا بھیس بنا کر کولڈ اسٹوریج کے آس پاس گھوما ہوں۔ یہ سارا آلو کولڈ اسٹوریج کے مالک کا ہے۔ یہ کسان تیار کیے ہوئے ہیں۔"

افسر نے اپنے چیمبر میں آ کر سب کا بیان کاغذ پر درج کیا۔ سب نے ایک ہی بات دہرائی کہ ہم کسان ہیں، آلو پیدا کرتے ہیں۔ فصل پر آلو سستا ہوتا ہے تو ہم اسے کولڈ اسٹوریج میں رکھ دیتے ہیں۔ کولڈ اسٹوریج سے فصل کے بعد والے زمانے میں نکال کر یہ آلو اچھے داموں میں بیچ دیا جاتا ہے۔ سرخ نیلی تلپٹی پر ہمارے ہی انگوٹھے کے نشان ہیں۔

ان کے چہروں پر کوئی زیادہ جھوٹ بھی نہیں برس رہا تھا۔ انہوں نے ایک ایک لفظ صحیح کہا تھا۔ صرف درمیان میں ایک جملہ اور بھی جوڑا جاسکتا تھا کہ ٹھاکر صاحب فصل پر آلو پیدا ہوتے ہی ہم سے اونے پونے خرید لیتے ہیں کہ اس وقت ہمیں ان کا بیاج ادا کرنا ہوتا ہے۔

افسر نے ان کے چہرے پڑھے اور کارروائی مکمّل کر کے اطمینان کی سانس لی، کیس ختم کرنے سے پہلے ساری ضروری کارروائیاں مکمّل ہو گئی تھیں۔ کیس پڑھنا، شک کرنا، شک دور کرنے کے لیے نوٹس بھیج کر گواہوں کو بلانا، ان کے بیانات کا اندراج کرنا اور پھر فیصلہ سنا دینا۔ ٹھاکر صاحب نے آفس سے نکلتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کمر سے جھکتے ہوئے "صاحب" کا شکریہ ادا کیا اور اظہارِ افسوس کیا کہ آپ کو اس کیس میں خواہ مخواہ محنت کرنی پڑی اور اتنے لوگوں کے بیانات درج کرنے پڑے۔ صاحب نے خاک ساری کے ساتھ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ "یہ تو ہمارا فرض تھا۔"

ٹھاکر صاحب چوری کے بعد کئی دن تک گاؤں میں آتے رہے۔ وہ روز شام کو گڑھی کی بیٹھک میں بیٹھ کر دانت پیستے رہتے اور ان نوکروں کو ماں بہن کی سناتے رہتے جنھوں نے چوروں کے ہاتھوں نشے کی سگریٹیں پی تھیں۔

ایک دن ایسے ہی بیٹھے تھے کہ باہر شور ہوا۔ نکل کر دیکھا تو گڑھی کی چار دیواری میں ایک مادہ نیل گائے دو بچوں کے ساتھ ہانپتی ہوئی اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر وحشت کے عالم میں دوڑ رہی تھی اور دھول اُڑا رہی تھی۔ گیہوں کے کھیت کٹنے کے بعد کھیت میدان ہو گئے تھے اور چُھپنے کی جگہ نہیں بچی تھی۔ کتّوں نے رگیدا ہو گا اور بے چاری بچّوں کی کم رفتار سے مجبور ہو کر گاؤں کی سمت بھاگ پڑی ہو گی۔ مادہ تو ٹوٹی ہوئی چار دیواری پھلانگ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ آگے جا کر رُکی، مڑ کر بچوں کی طرف دیکھا۔ دُم تیزی سے ہلائی پھر چار دیواری کی طرف بھاگ کر واپس آئی، کتّوں نے پھر رگیدا۔ مجبوراً اسے کھیتوں کی طرف بھاگنا پڑا۔ بچّوں کو، بھورے بھورے بڑی

بڑی آنکھوں والے، بچّوں کو پکڑ کر نیم کے درخت سے باندھ دیا گیا۔ ان میں کا ایک، نیم کے درخت سے بندھا بندھا تیزی سے درخت کا طواف کرتا اور جب رسّی درخت سے لپٹ جاتی اور گردن میں بل پڑنے لگتے اور آنکھیں اُبلنے لگتیں تو پھر مخالف سمت میں دائرے کاٹنے لگتا۔ اس نے درخت سے سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب سورج غروب ہو رہا تھا تو وہ زمین پر گر کر تیز تیز سانس لینے لگا۔ خون کی اُلٹی ہوئی اور تھوڑی دیر بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ دوسرے بچّے کی ٹانگیں باندھ دی گئی تھیں اور اسے نیم کے تنے سے سر ٹکرانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

اتنے میں گاؤں کے لوگ آپہنچے۔ ایک بوڑھے نے تاسّف کے ساتھ کہا۔ ”ہائے رے دیّا، گئوماتا کا بدھ ہوئے گیا۔“ ٹھاکر کی آنکھیں یہ سن کر چمکنے لگیں۔ انہوں نے بوڑھے کو ڈانٹ کر چپ کرا لیا اور بتایا کہ اگر یہ جانور پکڑے نہ جاتے تو یہ گاؤں کے غریب کسانوں کے گھروں میں گھس کر، ڈھونڈ ڈھونڈ کر ننھے ننھے بچّوں کو اپنے پیروں سے کچل ڈالتے۔ گاؤں والوں نے اوپر والے کا شکر ادا کیا کہ آج ٹھاکر اُودَل سنگھ کی وجہ سے ان کے معصوم بچوں کی جانیں بچ گئیں۔

ٹھاکر اُودَل سنگھ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ مرنے والا بچّہ کتنا جری اور قوی تھا۔ نیم کے تنے پر بچّے کے سر کی مار کے نشان دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا، جو بچّہ بچ گیا ہے، اسے وہ پالیں گے کیوں کہ اوّل تو یہ ”گئوماتا“ ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ یہ بڑا ہو کر اجنبیوں کو اپنے سینگوں سے لہولہان کر کے انہیں اپنے گھروں سے کچل سکتا ہے، تیسرے یہ کہ اسے کھلانے پلانے کا کوئی خاص خرچا نہیں ہو گا، کبھی کبھی اپنے کھیتوں کا چارا بھی کھا لیا کرے گا، چوتھے یہ کہ گوشت کے پارچے نہیں کھاتا۔

ٹھاکر صاحب نے اسے اس انداز سے پالا کہ آدھا وقت وہ قصبے میں رہتا اور آدھا وقت گاؤں میں کاٹتا۔ گاؤں کی گڑھی اور قصبے کی حویلی میں پانچ میل ہی کا تو فاصلہ تھا۔ وہ اسے نیلا کہہ کر پکارتے تھے اور لوگ اسے ٹھاکر کا نیلا کہہ کر بلاتے تھے۔

شروع شروع میں بہت دقتیں پیش آئیں۔ اوّل تو یہ کہ وہ وحشی تھا، کسی طرح بندھنے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ پہلے اسے بھوکا رکھا گیا، بھوک نے اس کی وحشت کم کی پھر اسے خوب پیٹ بھر کر ضرورت سے زیادہ غذا دی گئی تب خوش خوری نے اس کی وحشت بظاہر ختم کر دی۔ گاؤں اور قصبے والے اسے تفریح کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ٹھاکر اُودَل سنگھ اسے ہمیشہ باندھ کر رکھتے تھے۔ وہ ہرا چارا ناشتے میں کھاتا تھا۔ موٹے ناج کی سانی لنچ میں اور ڈنر میں ثابت ناج اور گڑ۔ کبھی سُوپ کے طور پر اس کے منہ میں کھو کھلے بانس کا نلکا ڈال کر سرسوں کا خالص تیل پلایا جاتا۔ دو سال میں اس کا سینہ پُر گوشت، بدن سڈول اور سینگ ہلالی ہو گئے۔ ماتھے پر سفید بھنوری کے بال جگہ بنانے لگے۔

ایک دن ٹھاکر صاحب نے محسوس کیا کہ نیلا اب اتنا بڑا اور طاقت ور ہو گیا ہے کہ رسّی کی بندش صرف عادت کے طور پر یا فرماں برداری میں قبول کرتا ہے ورنہ چاہے تو ایک ہی زقند میں رسّی اور رسّی کے دوسرے سرے پر کھڑے بھوندو کسان کو لے کر اُڑ جائے۔ اگر رسّی سے آزاد کر دوں تو کیا بھاگ جائے گا۔ انہوں نے سوچا اور کچھ یاد کر کے وہ مسکرائے۔ رات کو گڑھی کے آنگن میں لیٹ کر انہوں نے پچھلے سال کا چیئرمینی کا الیکشن یاد کیا۔ ان کی موافقت کے لوگ سات ممبری کا چناؤ جیتے تھے اور مخالف امیدوار کی موافقت کے آٹھ ممبران بھی فتح یاب ہوئے تھے۔ ان پندرہ ممبران کو چیئرمین کا انتخاب کرنا تھا۔ پچھلے بیس برس سے وہ بلا شرکتِ غیرے چیئرمینی کے تنہا امیدوار ہوتے آئے تھے۔ ممبروں کے ذریعے چناؤ محض رسمی خانہ پری ہوتا تھا مگر اب زمانہ بدل رہا تھا۔ عجیب عجیب نعرے سننے میں آتے تھے کہ ”ٹھاکر ہی کیوں بارم بار -- نہیں چلے گا اک پریوار“ یا ”ٹھاکر کو ہے ہٹانا -- ہم کو بھی آزمانا۔“

ابھی چیئرمینی کے چناؤ میں پانچ دن باقی تھے۔ مخالف کیمپ آٹھ امیدواروں کے ساتھ جیتا تھا، اس لیے چناؤ سے پہلے ہی جشن منا رہا تھا، جشن کی آوازیں کانوں میں آتیں تو ٹھاکر کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ وہ حویلی کی چھت پر کھرّی چارپائی پر لیٹے لیٹے رات گزار دیتے۔

چناؤ سے تین دن پہلے جھمّن چمار ممبر غائب ہو گیا۔ پولیس میں گم شدگی کی رپورٹ لکھائی۔ یہ رپورٹ ٹھاکر صاحب نے لکھوائی تھی۔ ان کا بیان تھا کہ جھمّن اندر ہی اندر ان کا موافق تھا۔ مخالف امّیدوار محمود صاحب یہ بات جان گئے تھے، انہوں نے اسے اغوا کرا کے مروا ڈالا ہے۔

محمود صاحب کی طرف سے بھی رپورٹ ہوئی۔ اس کا لبِ لباب بھی وہی تھا۔

پولیس نے تفتیش تیز کر دی یعنی دونوں امّیدواروں کو قرقی کی دھمکی دے کر دونوں سے کہا گیا کہ چناؤ کے دن تک مقتول کو ہر حال میں حاضر کرنا پڑے گا۔ دونوں امّیدواروں نے پولیس سے وعدہ کیا۔

دن میں ٹھاکر صاحب قصبے کی حویلی میں پولیس کے سب انسپکٹر انچارج کو کھانے کی میز پر تفتیش کراتے اور رات کو بارہ بجے کے بعد گاؤں پہنچ کر گڑھی کے تہہ خانے میں جھمّن کو

ڈنڈے پر کپڑا لپیٹ کر پڑواتے۔ چناؤ سے ایک دن پہلے انہوں نے جھمّن کو سمجھایا کہ "ہمارا ساتھ دینے میں تمہارا جو فائدہ ہے، اسے تم سمجھ نہیں پارہے ہو۔ ایک تو یہ کہ میں تمہیں چیئرمین بننے کے بعد صفائی کا ممبر انچارج بنادوں گا۔ صفائی کے عملے کی اسامیاں تم اپنی مرضی سے بھرنا۔ قصبے میں نل لگوانے کا کام بھی تمہارے ہی سپرد ہوگا۔ سو نل منظور ہوتے ہیں، کم از کم پندرہ ضرور لگوانے ہوں گے۔ روزانہ سڑک کی نالیوں پر چونا ڈلوانے کا ایک بجٹ ہوتا ہے۔ اس پیسے کو تم دھرم کے کام میں لگا سکتے ہو جیسے اپنی بیٹی کی شادی کا کھانا اور کپڑے وغیرہ۔ کیوں کہ روزانہ چونا ڈلوانے سے نالیوں میں چونے کی لگدی جم جائے گی جس کی وجہ سے "مزید گندگی کا خطرہ ہے۔"

انہوں نے اسے یہ بھی سمجھایا کہ شہر کے کچھ غنڈے اس کی لڑکی کو اغوا کر کے اپنے کام میں لانا چاہتے تھے۔ ٹھاکر نے بڑی مشکل سے روکا ہے اور ان غنڈوں کو اچھی طرح سمجھادیا گیا ہے کہ جھمّن ہمارا آدمی ہے۔ آدمی کیا، ہمارا بھائی ہے، ہمارا موافق ہے، ہمیں ووٹ دینے جارہا ہے۔

انہوں نے باتوں باتوں میں یہ بھی سمجھایا کہ ان شہری غنڈوں نے یہ کام صرف ان کے کہنے کی وجہ سے نہیں کیا اور وہ یہ دھمکی دے گئے ہیں کہ اگر جھمّن ٹھیک سے راضی نہیں ہوتا تو اُس کا گلا کاٹ کر، اس کے کپڑے خون میں بھگو کر محمود صاحب کے گھر کے پچھواڑے کھنڈر میں ڈلوادو۔" یہ سن کر جھمّن نے اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ سلامت پایا تو ٹھاکر صاحب کا ہاتھ جوڑ کر شکریہ ادا کیا۔

گڑھی کے خنک آنگن میں لیٹے لیٹے ٹھاکر صاحب نے پچھلے موسم کی وہ رات یاد کی اور اس یاد میں مزہ محسوس کیا کہ کیسے انہوں نے اچانک ایک فیصلہ کیا تھا۔ وہ جھمّن سے اچانک آواز بدل کر بولے تھے۔ "جھمّن! تو کیا سمجھتا ہے کہ میں تجھے اپنی چیئرمینی کے لیے اُٹھا کر لایا ہوں۔ نہیں بالکل نہیں۔ ایسا وچار بھی من میں مت لانا -- نہیں، تو شاید اب بھی یہی سوچ رہا ہے۔" جھمّن چپ چاپ کھڑا ہولے ہولے کانپتا رہا۔ ٹھاکر نے چہرے پر ایک طرح کا سادھو سنتوں والا تیج پیدا کیا اور بھاری مصنوعی آواز میں بولے۔ "چلو جھمّن تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آئیں۔ کل جسے دل چاہے، ووٹ دینا۔" وہ حیران کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔

ٹھاکر نے پہلے اس کی ٹانگوں سے رسّی کھولی پھر ہاتھوں کی رسیاں کھولیں۔ اس کی آنکھوں پر انگوچھا باندھا اور اسی عالم میں گاؤں سے لا کر قصبے کی عیدگاہ کے پیچھے جا کر جیپ سے اتارا اور انگوچھا کھول کر اسی کی چپ چپاتی آنکھوں میں دیکھنے لگے، دیکھتے رہے، یہاں تک کہ وہ بھی انہیں دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ اس نے آج تین دن اور تین راتوں کے بعد اپنے پیر اور ہاتھ آزاد پائے تھے، اس نے آنکھیں مل کر ٹھاکر کا چہرہ دیکھا۔ اسے ٹھاکر کے چہرے کے چاروں طرف ایک ہالا سا نظر آیا جیسے رام لیلا کی تصویروں میں ہوتا ہے۔ ٹھاکر جو ابھی تک اس کا ایک ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، سوچ رہے تھے کہ یہ ہاتھ چھوڑ دوں یا پکڑے رہوں، اس سے کچھ بولوں کہ کچھ نہ بولوں۔ جھمّن نے اس ہاتھ کی پروا نہیں کی۔ اسے اپنی جان بچنے کی خوشی میں یہ خیال ہی نہیں تھا کہ اس کا ہاتھ ابھی تک ٹھاکر کی گرفت میں ہے۔ پَو پھٹنے والی تھی۔ بیر کے درختوں میں تیتر بولا۔ نیک شگون لے کر ٹھاکر نے جھمّن کی سُوکھی کلائیوں میں قدرے اطمینان سے دوڑتے خون کی رفتار محسوس کی اور ہاتھ آزاد ہونے کا جو واحد فائدہ جھمّن کی سمجھ میں آیا وہ یہ کہ اب اطمینان سے جھک کر وہ دونوں ہاتھ جوڑ سکتا تھا، اس نے یہی کیا۔

الیکشن میں ٹھاکر کو ووٹ دینے کے بعد اس نے تھانے میں یہ بیان دیا کہ وہ دل سے ہمیشہ ٹھاکر صاحب کا موافق رہا ہے۔ محمود صاحب کے ڈر سے وہ دلّی بھاگ گیا تھا اور وہیں نظام الدین اسٹیشن پر تین دن تین راتیں گزار کر آیا ہے۔ پولیس سب انسپکٹر نے فائل رپورٹ کی اور حاشیے میں ٹھاکر صاحب کے تعاون کا جلی حروف میں ذکر کیا جواب چیئرمین بھی تھے۔

صرف ایک سال پرانی یاد میں بھی اتنا مزہ آسکتا ہے، یہ سوچ کر ٹھاکر کو اور لطف آیا۔ کھیتوں کی طرف سے ہوائیں اور لوریاں دیتی ہوئی آئیں۔ پہرے کے نوکروں کو گالیاں دے کر انہوں نے ہوشیار کیا، بندھے ہوئے نیلے کو ایک نظر پیار اور ایک نظر اختیار کے ساتھ دیکھا اور سو گئے۔

صبح اُٹھ کر انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آسمان پر نگاہ پھینک کر دیکھا، پَو پھٹنے میں کتنی دیر ہے۔ جب میلا میلا اجالا اتنا روشن ہو گیا جتنا پچھلے سال جھمّن کا ہاتھ چھوڑتے وقت تھا تو انہوں نے کان لگا کر کوشش کی کہ کسی بیر کے باغ میں تیتر بول جائے، نہیں بولا۔ البتہ کوئی ٹیٹری زور سے چیخی۔ اسی کو تیتر کی آواز پر محمول کر کے انہوں نے آگے بڑھ کر نیم کے درخت سے بندھے نیلے کو رسّی سے آزاد کر دیا۔ وہ رسّی کھل جانے کے بعد بھی ویسے ہی کھڑا رہا، ہلا تک نہیں۔

ٹھاکر صاحب نے زور سے آواز دے کر اپنے چھوٹے بیٹے لونکار ناتھ کو بلایا۔ اس کی آنکھوں میں رات کی شراب کا خمار تھا، نیلے کو آزاد دیکھ کر اس کا خمار ٹوٹا۔ اس نے حیرت سے اپنے باپ کو

بور

- ❀ افراد اور اشیا آج یہاں ہیں، کل نہیں لیکن وہ آج یہاں ہے اور کل بھی یہیں۔
- ❀ جب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچتا وہ تب بھی بولتا رہتا ہے۔
- ❀ اگر آپ دو افراد کو دیکھیں اور ان میں ایک کے چہرے پر بیزاری ہو تو دوسرا شخص وہ ہوگا۔
- ❀ وہ ایسی باتوں سے بھرا ہوا ہے جنہیں کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔
- ❀ وہ ایک لمحے کی بات گھنٹے بھر میں کہہ سکتا ہے۔
- ❀ اُسے الفاظ کا اسہال اور خیالات کا قبض ہے۔
- ❀ وہ ایسا بیزار کن شخص ہے کہ ایٹمی حملے کے دوران بھی کوئی اس کی محفوظ پناہ گاہ میں پناہ نہ لے۔
- ❀ وہ بے حد مہذّب ہے، آپ کو کسی بھی موضوع پر بیزار کر سکتا ہے۔
- ❀ وہ آپ کے تخیل کے لیے بہت کم چھوڑتا ہے اور آپ کی برداشت کے لیے اس سے بھی کم۔

لوئیس اے سیفیان۔ترجمہ، رفیق احمد نقش

دیکھا۔ باپ نے چہرے پر غیر ضروری تاؤ لائے بغیر مضبوط آواز میں دھیمے دھیمے کہا۔ ”ایسے ہی چھمّن کو رام کیا تھا پچھلے سال۔“

نیلے نے یکایک اپنی زندگی میں ایک خوش گوار تبدیلی محسوس کی۔ گردن میں جو موٹی سی چیز چبھتی رہتی تھی وہ دور ہو گئی ہے۔ اب چلنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ اگر کبھی تیز چلنے کو دل چاہے تو رسّی پکڑنے والے کا بوجھ بھی گھسیٹنا پڑتا تھا۔ اب سب کچھ کتنا ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے جبلی طور پر اسے ایک خدشہ لاحق ہوا کہ اور باتیں بھی تو تبدیل نہیں ہو گئیں۔ لیکن جب صبح ہرا چارا، دوپہر کو سانی اور رات کو ناج اور گڑ ملا تو اس نے طبیعت میں بہت چونچالی محسوس کی۔ وہ گڑھی کے چاروں کونوں میں گھومتا پھرا۔ ایک بار دروازے سے نکل کر باہر بھی گیا۔ گاؤں والے اسے کھلا دیکھ کر چونکے۔ کچھ ہد کے، کچھ اس کی آزادی کے خیال سے خوش ہوئے۔

نیلا تھوڑی دیر بعد واپس گڑھی میں آگیا اور نیم کے درخت کے نیچے آکر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے اندر ہی اندر گردن پر تناؤ محسوس ہوا۔ دراصل جب دھوپ اس جگہ آجاتی تھی تو وہ اُٹھ کر لمبی رسّی گھسیٹتا ہوا درخت کے سائے والے حصے میں چلا جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس پر دھوپ آگئی تھی۔ روزانہ اسی گھڑی اسے اُٹھ کر رسّی کی گرفت کے سہارے سائے میں جانا ہوتا تھا اس لیے اسے دھوپ اور رسّی کا تناؤ ساتھ ساتھ محسوس ہوا لیکن جب وہ سائے کے حصے کی طرف بڑھا تو اس پر انکشاف ہوا کہ آج رسّی کا تناؤ گردن پر نہیں ہے۔ وہ اگلے دونوں پیر زمین پر مار کر اگلے دھڑ سے اُٹھا اور نیم کے تنے پر اپنے سر سے ایک سبک سی ٹکّر ماری۔ یہ آزادی کے رقص کی پہلی تال تھی۔

ٹھاکر صاحب نے آہستہ آہستہ اسے کچھ افراد سے مانوس کرا دیا جس کا لامحالہ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دیگر افراد کو تھوڑا تھوڑا سا غیر سمجھنے لگا۔ قصبے میں جس صبح انہیں یہ خبر ملی کہ رات نیلے نے گڑھی کی دیوار پھلانگ کر شیشم کی سُوٹ چرا کر بھاگنے والے شامو کی کمر توڑ دی ہے تو مارے خوشی کے حویلی میں ناچے پھرے۔ گاؤں پہنچے اور نیلے کے منہ میں کھوکھلا بانس ڈال کر اپنے ہاتھ سے ایک سیر تیل پلایا۔ تیل پی کر وہ اُچھلنے لگا۔

ٹھاکر نے بیٹھک میں آکر گاؤں کا ہجوم دیکھا جو نیلے کی شکایت لے کر آیا تھا۔ جواب میں ٹھاکر نے صرف ایک ہی بات پوچھی۔ ”رات کے دو بجے شامو گڑھی میں کیا پوجا کرنے آیا تھا؟ بولو، جواب دو، چپ کیوں ہو“---- ظاہر ہے کہ اس بات کا جواب کون دیتا، رات کو دو بجے واقعی پوجا کا کوئی مناسب وقت نہیں ہوتا۔ ٹھاکر نے کہا۔ ”یہ گئوماتا کا اوتار ہے۔ دُشٹ لوگوں کا ٹھیک ٹھیک پر بندھ رکھے گا۔“

ہجوم اُٹھ کر چل دیا۔ کچھ بڈھوں نے گڑھی سے نکلتے وقت کن انکھیوں سے نیلے کو دیکھا جو اگلے پیر زمین پر مار مار کر دھول اُڑا رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے ہاتھ جوڑ کر اوتار کو پرنام کیا۔

گڑھی میں رکھے زیورات کی حفاظت کے اس انوکھے انتظام سے ٹھاکر کا رُواں رُواں خوش ہو گیا۔

نیلا کبھی کبھی قصبے کی حویلی میں بھی رات گزارتا تھا۔ ٹھاکر نے یہ بھی سوچ سمجھ کر کیا تھا تاکہ قصبے اور دیہات دونوں پر نیلے کی یکساں دہشت قائم رہے۔ نیلا ابھی پٹھا تھا، مکمل بالغ نہیں ہوا تھا اس لیے مستی میں نہیں آتا تھا، وہ ان کے ساتھ کتّے کی طرح رہتا تھا، ساتھ ساتھ، وفادار آگے پیچھے، دائیں بائیں۔

دیہات کی کھیتی باڑی گروی گانٹھ کا کام سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ نیلے کی وجہ سے چوروں سے بھی خوب حفاظت تھی۔ اسی طرح قصبے کی حویلی میں کبھی کبھی رات گزارنے کی وجہ سے وہاں بھی چوروں کا خطرہ نہیں رہا۔ اب تو کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگا کہ چور تو چور، جو لوگ حویلی یا گڑھی میں اپنا حق

لینے آتے جیسے گیہوں کاٹنے والے اپنی مزدوری کا گٹھا یا چھت پر مٹی ڈالنے والے مزدور اپنے حصّے کا اناج، تو ان پر بھی نیلا دوڑ پڑتا۔ وہ لوگ ٹھاکر سے منّت سماجت کرتے، نیلے کی کارکردگی کی مبالغے کے ساتھ تعریف کرتے تب ٹھاکر خوش ہو کر انہیں ان کا حق دیتے۔

دیہات اور قصبے کی طرف سے فراغت محسوس ہوئی تو ٹھاکر نے شہر کی تجارت میں توجہ بڑھائی۔ دیہات والی چوری کے سانحے کے بعد اِدھر وقت نہیں دے پائے تھے۔ شہر کی تجارت بھی زوروں پر چلنے لگی۔

ویسے تو نیلا زیادہ تر کام معمول کے مطابق کرتا تھا یعنی دیہات میں رہتا تو کسی بھی کھیت میں دو چار منہ مار دیتا، جانور یہ تفریق نہیں کر سکتے کہ یہ تیرا ہے، یہ میرا ہے۔ کبھی کبھی گڑھی سے تالاب کی طرف جاتے ہوئے اگر گلی تنگ ہے تو وہ راستے میں ملنے والے افراد کے درمیان سینگوں سے راستہ بنا لیتا۔ یہ بات بھی ہر فردِ بشر آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ سینگوں کے بجائے اگر کھروں سے راستہ بناتا تو اس میں لوگوں کو زیادہ زخم آتے۔ کبھی کبھی یوں ہی دولتّی بھی چلا دیتا جس سے ان لوگوں کے کپڑے اور کپڑوں کے نیچے ذرا کھال وغیرہ بھی پھٹ جاتی، معلوم نہیں کیوں لوگ باگ بیچ راستے میں چلنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔

اسی طرح جب وہ قصبے میں ہوتا تو کبھی کبھی پڑوس کے کسی بھی گھر میں گھس پڑتا اور مٹّی کے برتن وغیرہ توڑ کر شاداں و فرحاں واپس آتا۔

ٹھاکر نے شکایت کے جواب میں ہمیشہ یہی کہا کہ نیلے نے آج تک کسی کے تانبے پیتل کے برتن نہیں توڑے، ہمیشہ مٹی کے توڑے۔ ٹھاکر چاہتے تھے کہ لوگ نیلے کے اس حسنِ تفریق کی داد دیں۔

رفتہ رفتہ لوگ اس سے بیزار ہونے لگے۔ خصوصاً دیہات میں لوگ اپنے کم زور کواڑ بھی بند رکھتے۔ قصبے میں بھی نیلے کو دور سے دیکھتے ہی اہم چیزیں چھپالی جاتیں اور دروازے اگر کھلے ہوں تو بند کر لیے جاتے۔ ٹھاکر نے لوگوں کی یہ بیزاری بہت بری سمجھی۔ انہیں اکثر خیال آتا کہ وہ کیسے لوگوں کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں، جن میں ذرا بھی حسِ مزاح نہیں، ذرا بھی چونچالی نہیں۔

ایک دن گل فام کنجڑا شام کو روتا ہوا قصبے کی حویلی میں آیا اور بیٹھک میں ٹھاکر کے پیر پکڑ لیے۔ اس نے احوال بیان کیا کہ وہ خوانچہ لگا کر امرود بیچ رہا تھا کہ کسی اشتعال کے بغیر نیلے نے

دلیل

مشفقِ خواجہ صاحب کے سامنے مجروح سلطان پوری کے دو شعر فیض احمد فیضؔ کے شعر کہہ کر سنائے گئے۔ اُنہوں نے اعتراض کیا کہ یہ شعر فیضؔ کے نہیں ہیں۔ ایک صاحب نے خواجہ صاحب سے بحث شروع کر دی کہ نہیں، یہ شعر فیضؔ ہی کے ہیں۔ خواجہ صاحب نے مجروحؔ کا مجموعۂ کلام ان صاحب کے سامنے رکھ دیا جس میں دونوں شعر موجود تھے۔ اُن صاحب نے مجروحؔ کا مجموعہ اُلٹا پلٹا اور بولے۔ ”یہ تو جعلی ایڈیشن ہے۔“

خواجہ صاحب نے کہا۔ ”ایڈیشن جعلی نہیں، مجروحؔ صاحب کی اجازت سے پاکستان میں چھپا ہے۔ اس میں پاکستانی ناقد محمد علی صدّیقی کا دیباچہ ہے۔ وہ کبھی جعلی ایڈیشن پر دیباچہ نہیں لکھ سکتے۔“ انہوں نے کہا ”محمد علی صدّیقی کا دیباچہ بھی تو جعلی ہو سکتا ہے۔“

خواجہ صاحب نے کہا۔ ”کہیے تو فون پر محمد علی صدّیقی سے بات کرا دوں؟“ وہ صاحب کہنے لگے۔ ”اس کی کیا ضمانت ہے کہ فون پر اصلی محمد علی صدّیقی سے بات ہو گی۔ کوئی بھی آدمی اُن کے نام سے بات کر سکتا ہے۔“

❀ تعاون، احمد صغیر صدیقی

آکر پہلے تو اس کے پانچ عدد امرود کھائے، جب اس نے نیلے کو دھکّا دیا تو نیلے نے باقی امرود کچل دیے۔ جب اسے اس حرکت سے روکا گیا تو اس نے گل فام کے اوپر دو پیروں سے حملہ کر دیا جس سے اس کا بازو زخمی ہو گیا اور قمیص پھٹ گئی۔ وہ اس کا ہرجانہ چاہتا ہے۔

ٹھاکر نے اس کی بات توجہ سے سنی بلکہ کئی بار واقعات بیچ بیچ میں روک روک کر نئے سِرے سے سنے۔ اس درمیان انہوں نے نوکر بھیج کر کچھ پاس پڑوس کے، کچھ بازار کے آدمی بلوا لیے۔ جب سب آکر گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور گل فام نے ساتویں دفعہ واقعہ بیان کر لیا تو ٹھاکر نے اس سے ایک عجیب شانِ بے نیازی سے پوچھا۔ ”آج کا تہہ بازاری کا پیسہ بھرا تھا؟“

”نہیں سرکار، خوانچہ بڑھا کر ٹھیکے دار کو دیتا۔ شام کو دیتا۔“

”تہہ بازاری کا مطلب ہوتا ہے بازار میں بیچنے کے عوض اس سرکاری جگہ کا روزانہ کا کرایہ، اتنا تو جانتے ہو گے۔“

”ہاں سرکار۔“

”اگر تم نے اس وقت تک تہہ بازاری کا پیسہ نہیں بھرا تو اس کا مطلب ہے، صبح سے شام تک تم غیر قانونی انداز میں

بیٹھے۔ بولو، جواب دو؟"

گل فام چپ رہا۔ یہ نکتہ عام حالات میں بھی اس کی سمجھ میں آنا مشکل تھا، نہ کہ اس زخمی حالت میں، جب کہ اس کے امرودوں کا نقصان بھی ہو چکا تھا۔

"بولو بھائی! کچھ تو بولو۔ میں تمہیں پورا موقع دیتا ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو دولت اور کرسی کے نشے میں غریب کو بولنے بھی نہیں دیتے اور اپنی کہے جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے بیٹھے ہوئے تمام افراد کے چہرے پر آنے والے نئے قسم کے تاثرات کا معائنہ کرنا ضروری خیال کیا۔ تاثرات کچھ کچھ حسبِ منشا تھے۔ تجربے نے انہیں بتایا تھا کہ کبھی کبھی کچھ دیر خاموش رہنا، بولنے کے مقابلے میں زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ وہ چپ ہو گئے بلکہ خاک ساری کے انداز میں سر بھی نیچے جھکالیا۔

"تھوڑی دیر بعد انہوں نے دھیمے سے فیصلہ کن انداز میں کہا" آج تم نے تہہ بازاری کی چوری کی۔"

پھر کچھ دیر خاموش رہ کر انہوں نے اس سے بھی زیادہ دھیمی لیکن مضبوط آواز میں سوال کیا۔ "تمہارے کتنے امرود کھائے۔ دس، آٹھ، چار۔ یا پانچ۔ تم یہ بات سات دفعہ دہرا چکے ہو۔ میں اپنے کانوں سے چھ بار سن چکا ہوں۔ جب سے یہ پندرہ لوگ یہاں بیٹھے ہیں، تم کئی بار اپنے امرودوں کی تعداد بدل چکے ہو۔ بولو، کتنے امرود کھائے۔ سات بار یا چھ بار۔ ان پندرہ لوگوں کے سامنے جواب دو۔ میں تمہیں نو مرتبہ موقع دے چکا ہوں۔ بولو۔ سچ کہ جھوٹ۔ جواب دو" -- مگر گل فام بولا۔

"نیلے نے میرے پندرہ امرود یا سات امرود یا شاید نو امرود یا میرے خیال میں دو امرود کھائے تھے۔"

سب ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے۔ گل فام ان کی طرف بے بس نظروں سے دیکھتا رہا۔

"آپ لوگوں نے دیکھا، یہ کتنی بار امرودوں کی گنتی بدل چکا ہے۔ اب اس کی کس بات کا یقین کریں، خاص طور سے اس حالت میں کہ آج اس نے تہہ بازاری ٹیکس کی چوری بھی کی۔"

"سرکار! نیلے نے میرے ہاتھ پر لات چلائی اور خونا خون کر دیا۔" گل فام سسکنے لگا۔ ٹھاکر نے تمام افراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ دھرم ایمان سے بولنا، ہمارا نیلا جو ہاتھی کے برابر ہے، اگر اس لونڈے کو لات مارتا تو کیا یہ زندہ بچ سکتا تھا؟ کیا اس کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ نیلے نے اس کو لات ماری؟ جب کہ خود یہ اس بات کا اقرار کر رہا ہے کہ اس نے بغیر کسی اشتعال کے نیلے کو دو مرتبہ دھکا دیا۔"

"سرکار! جب اس نے میرے امرود کھائے تب دھکا دیا تھا۔"

"کون سے امرود؟ جن کی صحیح گنتی بھی تم ان پنچوں کے سامنے نہیں بتاپائے ہو؟"

کیوں کہ اب وہ پندرہ آدمی پنچ تھے اس لیے ان کا منصف مزاج ہو کر سنجیدگی کے ساتھ فیصلہ کرنا ضروری تھا۔ ان میں سے چند ایک چہروں پر ججوں جیسی سنجیدگی اور کرختی بھی آگئی تھی۔

فرداً فرداً ان پندرہ آدمیوں نے گل فام سے مختلف نوعیت کے پندرہ پندرہ سوالات کیے۔ گل فام نے ہر سوال کا جواب نہایت غلط دیا یعنی ان پنچوں نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا۔ اس دوران ٹھاکر بالکل چپ رہے۔ اب ان کے بولنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اب اگر بولتے بھی تھے تو چاروں طرف سے سوالات کے نرغے میں گرفتار گل فام کی طرف داری ہی میں کوئی جملہ ادا کرتے۔ ان کی اس غیر جانب داری بلکہ خود مخالفانہ رویّے نے پنچوں پر بہت اچھا اثر مرتب کیا۔ سب گل فام کو ملامت کرنے لگے۔

مجلس برخاست ہوئی تو سبھوں کا فیصلہ یہ تھا کہ گل فام باغوں سے امرود چرا کر بیچتا ہے اور اس پر یہ دھاندلی بھی کرتا

ہے کہ تہہ بازاری کا ٹیکس ادا نہیں کرتا۔ آج اس نے ایک مزید سینہ زوری کرنے کی کوشش کی، ایک معصوم گئوسمان پشو پر حملے کا الزام لگایا جو بے چارہ شام کے وقت ٹہلنے کے لیے بازار کی سڑک پر بائیں کنارے کی طرف دب کر ٹریفک کے اصول کے مطابق چل رہا تھا۔ یقیناً گل فام نے مزہ لینے کے لیے، جیسا کہ اس طرح کے اوباش لڑکے کرتے ہیں، اس بے زبان جانور پر دو یا پانچ یا سات یا نو دفعہ کچّے سخت امرود مارے جس سے ممکن ہے، جانور کو چوٹ آئی ہو۔ گل فام سو مرتبہ اُٹھا بیٹھی کرے اور ٹھاکر صاحب سے معافی مانگے۔

گل فام نے سو مرتبہ اُٹھا بیٹھی کرنی چاہی تو ٹھاکر نے اٹھانوے پر پہنچ کر اسے روک دیا اور پنچوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اب بس کیجیے، اتنی ہی کافی ہے، میرا دل بہت نرم ہے۔" ان کے لہجے میں آنسو دیکھ کر لوگوں نے گل فام کو روکا۔

گل فام اپنا ٹوٹا ہوا خوانچہ اور باقی ماندہ امرود لے کر آنکھوں میں آنسو بھرے حویلی سے نکلا تو دروازے پر نیلا کھڑا زمین پر پاؤں مار رہا تھا۔ پنچوں نے اسے للکار کر کہا۔ "ارے، اب اس بے زبان کو امرود تو کھلا دے ہتیارے۔"

ہتیارے نے خوانچہ زمین پر رکھ کر آنسو خشک کیے اور امرود دونوں ہاتھوں میں بھر کر بے زبان جانور کے سامنے پیش کیے۔

❁ جب دولت، اور اقتدار دونوں حاصل ہوں تو بگڑی بات بنانے میں زیادہ زحمت نہیں اُٹھانی پڑتی۔ ایک دن ٹھاکر اس فلسفے پر غور کر رہے تھے تو ان پر ایک عجیب و غریب انکشاف ہوا کہ جب سے وہ دیہات اور قصبے کی دولت کی حفاظت سے بے فکر ہوئے ہیں، سیاست اور تجارت میں خوب وقت دینے لگے ہیں۔ توجّہ اور وقت دینے کی وجہ سے سیاست اور تجارت پہلے سے کئی گنا ترقّی پر ہیں یعنی ان سب ترقّیوں کے پیچھے نیلے کا ہاتھ ہے۔ انہیں یہ بات مضحکہ خیز محسوس ہوئی مگر وہ جتنا غور کرتے، اسی نتیجے پر پہنچتے کہ ان کی حالیہ ترقّی میں نیلے کا بہت عمل دخل ہے۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح تھی، دیہات اور قصبے دونوں میں لوگ ٹھاکر صاحب سے زیادہ نیلے سے خوف کھانے لگے تھے۔ لوگ جانتے تھے کہ ٹھاکر صاحب اگر براہِ راست کسی کو کوئی گزند پہنچائیں گے تو اس کی تو داد فریاد ہے لیکن نیلے کی کسی حرکت کی داد فریاد اس لیے نہیں ہے کہ اس کی حمایت میں ٹھاکر صاحب کے علاوہ بہت سے غیر جانب دار لوگ بھی شامل ہو جاتے تھے۔ کوئی نیلے کو بُرا کہہ کر خواہ مخواہ شراپ بھی نہیں لینا چاہتا تھا کیوں کہ ٹھاکر صاحب نے مختلف لوک گاتھاؤں سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ نیلا بھی گائے ماتا کے بہت ہی قریبی عزیزوں میں ہوتا ہے یعنی تقریباً کزن جیسا۔ انہوں نے کزن کا ہندوستانی ترجمہ کر کے بھی بتایا تھا۔

آہستہ آہستہ صورتِ حال کچھ یوں ہو گئی کہ جو لوگ نیلے سے مضروب ہوتے، وہ بھی اس بات کا کھلم کھلا اعتراف نہ کرتے، مبادا انہی کی کوئی غلطی سامنے آجائے۔ صورتِ حال اس حد تک پہنچانے کے لیے کئی واقعات عالمِ ظہور میں پیش آئے جن میں کچھ دیہات میں وقوع پزیر ہوئے اور کچھ واقعات کے لیے قدرت نے قصبے کا انتخاب کیا۔

❁ دیہات میں گڑھی کے ٹھیک سامنے نھّو کمہار کی بیوہ اپنی دو جوان بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ نھّو کمہار کا پچھلے دنوں عارضۂ دق میں انتقال ہو گیا تھا۔ صبح تین بجے اُٹھ کر تینوں ماں بیٹیاں گدھوں کو لے کر نکل پڑتیں اور دُور دُور کے تالابوں کی مٹی کھود کر گدھوں پر لاد لاد کر صبح منہ اندھیرے واپس آجاتیں۔ پھر گارا تیار کرتیں۔ کمہار کی جوان بیٹیاں پنڈلیوں تک گارے میں کھڑی، لنہگا ذرا ذرا سا اڑسے ہوئے، پھاوڑے سے گارا نرم کرتی رہتیں۔ ماں چاک پر بیٹھی برتن ڈھالتی رہتی۔ چار پانچ دن کی محنت کے نتیجے میں جب اتنے برتن بن جاتے کہ بھٹّی سلگا کر پکائے جا سکیں تو اُپلوں کو بنیاد بنا کر پولے پولے ہاتھوں سے کچّے کچّے برتن اس انداز سے سجائے جاتے کہ ان کے بیچ سانس کی جگہ باقی رہے تاکہ آگ کی گرمی کی لہریں درمیان سے گزر کر تمام برتنوں تک پہنچ سکیں۔

ٹھاکر کے چھوٹے بیٹے اونکار کو کمہار کی بڑی بیٹی کے برتن بہت پسند تھے مگر وہ اونکار کو ہاتھ لگاتا تو ایک طرف، نظر بھر کر دیکھنے بھی نہیں دیتی تھی، پلّو سے چھپائے رکھتی تھی۔ اونکار اکثر گڑھی کی چار دیواری کے دروازے میں مونڈھا ڈال کر بیٹھ جاتا اور دس قدم دور گارے میں اُبھرتے ڈوبتے کمہار کی لونڈیوں کے پیر تاکتا رہتا۔ سانولے پاؤں اور اُجلے تلوے گارے میں ڈوبتے اور اُبھرتے، اسی رفتار سے اونکار کا دل بھی ڈوبتا اور اُبھرتا۔ وہ بیٹھا دیکھتا رہتا کہ لڑکیاں اس کی طرف سے منہ پھیر کر گارا اپنے پیروں سے دبا دبا کر نرم کر رہی ہیں۔ وہ وہیں بیٹھا بیٹھا گارے کی طرح نرم ہوتا جاتا اور اپنے اندر مختلف شکلوں کے برتن ڈھلتے محسوس کرتا رہتا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ بڑکی نے گارے کے چھینٹوں سے بچنے کے لیے اپنا لنہگا تھوڑا سا اونچا کر کے نیفے میں اڑس لیا ہے۔ اونکار اس کا بدن پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔ میلے میلے اُلجھے بالوں کے نیچے چمکتی ہوئی سانولی گردن، گردن کے نیچے دبلی پتلی سڈول کمان کی طرح کھنچی ہوئی کمر۔ پشت کے نیچے گارے کو تھپکی دیتے پیروں کی دھمک سے ہلتے ہوئے کولھے، پیوند لگا لنہگا اور گھٹنوں کی پشت کا پنڈلی کا سب سے اوپر کا حصّہ۔

اونکار کو معلوم تھا کہ بڑکی کی شادی پڑوس کے گاؤں میں طے ہو چکی ہے۔ لڑکا بھی ذات کا کمہار ہے اور انٹر کا امتحان دے رہا ہے۔ اونکار کسی بھی قیمت پر بڑکی کو شادی سے پہلے ایک رات کے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پرتاپ نے اسے اشاروں اشاروں میں منع بھی کیا تھا کہ اس میں پتا جی کی عزّت کا سوال ہے لیکن اونکار پر روزانہ گارے کی تھپکی کا جادو چڑھ چکا تھا۔ آج اس نے پہلی بار بڑکی کو اپنے آپ سے بے خبر، اتنا کھلا ہوا دیکھا تھا۔ اس نے موٹر سائی کل اٹھائی اور قصبے میں جا کر راکیش کو پوری بات بتائی۔ ٹھاکر اُودل سنگھ آج شہر گئے ہوئے تھے۔ دونوں نے شام تک بیٹھ کر حویلی میں شراب پی اور رات گئے موٹر سائی کل پر ایک اور ہم مشرب رمیش کو بٹھا کر واپس آئے۔ موٹر سائی کل ایکھ کے ایک کھیت میں چھپا دی۔ جاڑا بہت تیز تھا اور کہرا بھی تھا۔ جگہ جگہ گاؤں کا دھواں کہرے میں مل کے گاڑھا ہو کر ہوا میں معلق کچھ کچھ ٹھوس ہو گیا تھا۔ گاؤں سو چکا تھا لیکن گاؤں کے سونے کا مطلب خاموشی نہیں ہوتا۔ چھپّر تلے بندھی بھینسیں ایک دوسرے سے بدن رگڑتی رہتی ہیں۔ ایستادہ گائیں سوتے سوتے آنکھ کھول کر ڈکرانے لگتی ہیں اور بے خواب کتّے ایک دوسرے پر غرا غرا کر بے ضرر جھپٹیں کرتے رہتے ہیں۔

پہلے تو یہ تینوں چپ چاپ گڑھی میں داخل ہوئے۔ چار دیواری کے پاس ہی بیٹھا نیلا جگالی کر رہا تھا، دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور سینگ آگے کر کے، سر نیچا کر کے پینترے بدلنے لگا۔ اونکار نے دھیرے سے سیٹی بجا کر، پاس جا کر اسے تھپکی دی۔ دونوں کو اندر لایا۔ پرتاپ بھی شہر گیا ہوا تھا۔ اس کے کمرے میں اونکار کے دوستوں نے جھانکا۔ ہلکی چاندنی میں کھڑکی کے قتلے ایک جوان عورت کے بدن پر پڑ رہے تھے۔

"یہ کون مال ہے۔" رمیش نے اونکار سے پوچھا۔

"چپ سالے، بھابی ہے۔"

"ہو ہو ہو ہو۔" ----راکیش اور رمیش بے ڈھنگے پن سے شرمندہ شرمندہ ہنس رہے تھے۔

تینوں نے اونکار کے کمرے میں بیٹھ کر منصوبے کو آخری شکل دی۔ تھوڑی دیر بعد رمیش، نیلے سے بچتا ہوا گڑھی کے دروازے سے نکلا۔ کمہار کی بیوہ کے جھونپڑے میں چند گدھے بندھے خاموش کھڑے تھے۔ جھونپڑے کے پاس آکر رمیش نے آواز دی۔ "مائی او مائی!"

"کو ہے؟" اندر سے آواز آئی اور چاندی کے ہلکے زیور بجنے لگے۔ لڑکیاں بھی اُٹھ گئی تھیں۔ تینوں نے ایک ساتھ آکر بانس کا ٹٹر ہٹایا۔

"میں لکھن ہوں۔ کھلیل پور سے آیا ہوں۔ تمہارے ہووے والے جمائی پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دوَ ہے۔ تمہیں بلایو ہے۔"

"ہے ری دیّا۔" کہہ کر تینوں رونے لگیں۔ بڑی بیٹی نے

احتیاط کی کہ آواز زور سے نہ نکلے۔
لکھن نے مشورہ دیا کہ ماں اور چھوٹی بیٹی چلی چلیں۔ بڑی کی سگائی ہو چکی ہے، اس کا اُس گاؤں میں، خاص طور سے اُس گھر میں جانا ٹھیک نہ ہو گا۔
بڑی بیٹی کو اکیلے جھونپڑے میں چھوڑنا بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ لکھن نے مشورہ دیا کہ گڑھی میں بڑی بہو کے پاس چھوڑ دیا جائے۔
بڑی بہو نے اندر کا دروازہ کھول کر پہلے تو واقعے پر افسوس کا اظہار کیا پھر بڑکی کو اپنے کمرے میں بلا کر زمین پر بچھونا دے کر لیٹنے کو کہا۔
کمہار کی بیوہ اور چھوٹی بیٹی لکھن کے ساتھ گاؤں کی حد سے نکل گئے۔
سیاست داں باپ کے بیٹے کا منصوبہ بڑا چست اور درست تھا۔ لکھن نے گاؤں سے باہر آکر ان دونوں ماں بیٹی کو گھونسے مار مار کر قابو کیا اور سر درات تلے آموں کے ایک اُجاڑ باغ میں جس کی نشان دہی اونکار نے کر دی تھی، ٹیوب ویل کے کمرے میں رسّی سے باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس کر ڈال دیا۔ چلتے چلتے اس کے دل میں رحم آیا تو بہت سا پیال اُٹھا کر دونوں پر ڈال دیا۔
لکھن اب دوبارہ رمیش بن چکا تھا۔ اس نے گڑھی کے دروازے کے پاس آ کر آوازیں دیں، اونکار اپنے کمرے سے زور سے چلاتا ہوا نکلا۔ ”آتا ہوں، کون؟“
نیلے کی بہترین کارکردگی کی وجہ سے پہرے کے نوکر اپنی مڑھیا میں پیال اوڑھے سو رہے تھے۔
بھابی نے گھبرا کر کھڑکی پر آکر پوچھا۔ ”کون ہے اونکار؟“
”دیکھتا ہوں بھابی!“
دروازے پر آکر اس نے دھیمی آواز میں رمیش کی پوری کارکردگی کا احوال سنا اور بھابی کے کمرے کی کھڑکی کے پاس آکر بولا“۔ برابر کے گاؤں سے ایک آدمی آیا ہے، وہاں پتا جی کے دوست یادونا ساب پر کسی نے حملہ کر دیا ہے۔ مجھے بلایا ہے۔“
”جاؤ، بندوق لے جانا۔“
تینوں گاؤں سے باہر آکر کچھ دیر تک ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے رہے۔ بوتل کھول کر ایک ایک گلاس شراب اور پی اور آخری مرحلے کی طرف بڑھے۔ ان کا رخ گڑھی کی طرف تھا۔
صدر دروازے کے بجائے ٹوٹی ہوئی دیوار سے داخل ہوئے۔ اونکار چھپا رہا۔ دونوں نے آگے بڑھ کر آواز دی۔
”اونکار! اونکار بھائی!“ بھابی گھبرائی، آنکھیں ملتی ساڑی برابر کرتی ہوئی اُٹھی، کھڑکی پہ آکر پوچھا۔ ”کون ہو؟“
”یادونا ساب پر حملہ ہوا ہے۔ اونکار بھائی کو بلایا ہے۔“
”ابھی ابھی تو اونکار وہیں گئے ہیں۔ گاؤں سے نکلے ہی ہوں گے۔“
”اچھا تو ہم چلتے ہیں۔ آپ کے گھر میں ٹارچ ہو گی، بیٹری۔ ہماری ٹارچ راستے میں گر پڑی۔ دگڑے پر بہت پانی ہے۔ موٹر سائکل پھنس جائے گی۔“
”ہوں، ابھی لاتی ہوں۔“
اندر بڑکی جو سب سن رہی تھی، بھابی سے لپٹ گئی۔
”موہے ڈر لگ رؤاے۔“
”ڈرو مت۔ کبھی کبھی اچانک چاروں طرف سے مصیبت آجاتی ہے۔“ بھابی نے اسے دلاسا دیا۔ اس نے دروازہ کھول کر ہاتھ بڑھا کر ٹارچ دینا چاہا۔ رمیش نے بھابی کے ہاتھ کے بجائے کندھا پکڑ کر جھٹکے سے کھینچا اور اس سے پہلے کہ وہ چیخ سکے، منہ پر دوسرا ہاتھ رکھ کر اندر داخل ہو کر پلنگ پر گرا کر قابو کر لیا۔ بھابی پلنگ پر ٹانگیں مارتی رہی۔ بڑکی منہ پھاڑے یہ منظر دیکھ رہی تھی کہ راکیش نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ارہر کے پودوں کے گٹھے کی طرح باندھ کر ڈال دیا۔ بھابی مضبوط بدن والی نئی عمر کی عورت تھی، ابھی پچھلے ہی سال شادی ہوئی تھی۔ اسے قابو کرنے میں زیادہ وقت لگا کیوں کہ ایک ہاتھ سے منہ دبائے رکھنا بھی ضروری تھا۔ اس درمیان اونکار اندھیرے میں کھڑے نیلے کو تھپکیاں دیتا رہا۔ رمیش نے بھابی کو باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ رمیش کی سانس بھی اکھڑ گئی تھی۔ کچھ تو طاقت آزمانے کی وجہ سے اور کچھ بھابی کا گرم وگداز بدن دیر تک جکڑے رہنے کی وجہ سے۔ راکیش نے بڑکی کو کندھے پر اناج کی بوری کی طرح ڈالا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ بھابی بھی آنکھیں پھاڑے سارا منظر دیکھتی رہی۔
لالٹین بجھ گئی تھی۔ چاندنی جالی دار کھڑکی سے چھن چھن کر آرہی تھی۔ بھابی نے دیکھا کہ اسے قابو کرنے والا ابھی تک کھڑا اسے غور سے دیکھ رہا ہے اور ہولے ہولے ہانپ رہا ہے۔ وہ پیش آنے والے واقعے سے بے چین ہو کر بندھے بندھے تڑپنے لگی۔ اس کی ساڑی گھٹنوں سے اوپر سرک آئی تھی اور مدھم چاندنی میں اس کی پنڈلیاں دیوالی کی موٹی موٹی موم بتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہانپنے کی وجہ سے سینہ تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ رمیش نے کھڑے کھڑے کچھ سوچا۔ کھڑکی سے جھانک کر راکیش نے سرگوشی میں باہر سے کہا۔ ”ابے جلدی کر۔ کیا کر رہا ہے۔“

ازروئے روایت

عبرانی قوموں میں جنس، خاندانی نسب اور عبرانی سلسلہ جاری رکھنے کا ایک ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ پوری یہودی تاریخ اس کی گواہی پیش کرتی ہے کہ یہودی شوہر اپنی بیویوں پر پورا کنٹرول رکھتے تھے۔ ساتھ ساتھ انہیں لونڈیاں رکھنے اور طوائفوں سے تعلق قائم کرنے کا بھی پورا اختیار تھا۔ طلاق کا اختیار بھی انہیں پوری طرح حاصل تھا۔ ویسٹر مارک 9 کا خیال ہے کہ شوہر کا اپنی بیوی سے قطع تعلق کرنے کا اختیار یہودی آئینِ ازدواج میں مرکزی اہمیت رکھتا ہے اور شوہروں کا یہ اختیار رَبیوں کی عائد کردہ کچھ پابندیوں کے باوجود کبھی ختم نہیں کیا جاسکا ہے۔ یہودیوں کے یہاں دیوداسی نظام کو مذہبی سرپرستی اور نگرانی حاصل تھی۔

عبرانی روایت کے مطابق عورتوں کا وجود محض مردوں کی خدمت کرنے کے لیے ہے۔ مروّجہ یہودیت نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ عورتیں روح سے خالی ہوتی ہیں۔ یہودیت میں اظہارِ تشکر کے لیے جو دعائیہ کلمات طے کئے گئے ہیں ان میں یہ فقرہ بھی شامل ہے۔ "پروردگار تو پاک ہے، تو برتر ہے کہ تو نے مجھے عورت نہیں بنایا۔" تلمود کی مندرجہ ذیل عبارت اس بات کی دلیل ہے کہ بچی کی پیدائش کتنی حقیر تصور کی جاتی تھی۔

"ایک لڑکی اپنے باپ کے حق میں خالی خزانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی فکر میں اس کی رات کی نیندیں اُڑ جاتی ہیں۔ اس کی کم سنی میں اسے یہ تشویش لاحق رہتی ہے کہ کوئی اس کی آبروریزی نہ کرے، عنفوانِ شباب میں وہ کہیں غلط راہ پر نہ پڑجائے۔ پختہ عمر کو پہنچنے پر کہیں بن بیاہی نہ رہ جائے۔ شادی ہونے پر کہیں وہ اولاد کی نعمت سے محروم نہ رہے اور جب وہ سن رسیدہ ہوجائے تو کہیں جادوگری کو اپنا پیشہ نہ بنا بیٹھے۔"

منوّر انیس۔ بہ شکریہ ماہ نامہ ساحل کراچی۔

"آرہا ہوں بے!" یہ کہہ کر اس نے یاد کیا کہ دو تین گھنٹے پہلے ہی اس نے اس بندھی ہوئی عورت کو "مال" کہا تھا۔ وہ اس پر جھکا اور اسے گھورتا رہا۔ کھڑکی سے ہَوا کا ایک جھونکا آیا جس نے نشہ کچھ ہلکا کیا۔

وہ واپسی کے لیے مڑا، پھر کچھ سوچ کر پلٹا اور اس خیال سے کہ یہ عورت اس کی بدمعاشیوں کے یار اونکار کی بھابی ہے، اس نے ہاتھ بڑھا کر ساڑی پیروں تک سرکا دی۔

رات بہت اندھیری تھی۔ باہر نکل کر تینوں کمہار کے گھر تک آئے اور اونکار، بڑکی کو لے کر اس کے جھونپڑے میں گھس گیا اور دونوں باہر اندھیرے میں چھپ کر پہرا دیتے رہے۔ رمیش دھیمی دھیمی آواز میں راکیش کو اپنی تازہ فتوحات کا واقعہ سناتا رہا جسے سن کر راکیش "دھت دھت" کرتا رہا لیکن جیسے ہی رمیش خاموش ہوتا، راکیش اس کا چہرہ دیکھنے لگتا۔ "پھر کیا ہوا؟"

اونکار نے زمین پر پڑے پیال پر بڑکی کو ڈال دیا اور اس کی آنکھوں پر پٹّی باندھ دی اور اپنے سر سے مڑا سا کھول لیا۔ اندر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے ماچس جلا کر بڑکی کو غور سے دیکھا۔ اسے کچھ مایوسی سی ہوئی۔ دور سے یہ جتنی جان دار نظر آتی تھی، اتنی تگڑی نہیں تھی۔ اس نے ماچس دوبارہ جلائی اور اس کے سانولے پیر اور اُجلے تلوے دیکھے۔ پاؤں سانولے تھے اور تلوے اُجلے، لیکن ایڑیوں میں مٹّی اور پانی کے مسلسل برتاؤ کی وجہ سے دراڑیں سی پڑگئی تھیں۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر اندھیرے میں بڑکی کو ٹٹولا۔ بڑکی بھڑکنے لگی۔ آنکھوں پر پٹّی اور منہ میں کپڑا ہونے کی وجہ سے چہرے کی ہیئت عجیب سی ہوگئی تھی لیکن اتنی بدہیئت نہیں کہ اونکار کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے۔

چھپّر کا ٹٹّر لگا کر وہ تینوں کھیتوں تک آئے جہاں اِکھ میں موٹر سائیکل چھپا کر رکھی تھی۔ رمیش کو رخصت کیا اور اندازہ کرنے لگا کہ اپنے گاؤں سے ماں باپ کے گاؤں جانے اور وہاں سے آنے میں زیادہ سے زیادہ کتنی دیر لگ سکتی ہے، اتنا ہی وقت گزار کر وہ گڑھی پہنچنا چاہتا تھا جہاں بھابی بندھی ہوئی اس کا انتظار کررہی ہوگی۔

گڑھی میں آکر بھابی کے کمرے میں پہنچ کر بھابی کو اس حالت میں دیکھ کر اس نے وہ ساری حرکات کیں جو ایسے موقع پر اسے کرنی چاہیے تھیں۔

بھابی منہ کا کپڑا نکلتے ہی رونے لگی۔ جب اس نے پوری بات بتا کر بھی رونا جاری رکھا، اونکار کو شک ہوا کہ رمیش نے بھابی کے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی ہے؟ بھابی کی گردن کے نیچے اسے نیل کا نشان نظر آیا۔ اس کا سارا نشہ اتر گیا۔ پھر اس نے کرید کرید کر ڈاکوؤں کی حرکتوں کے بارے میں پوچھا۔ بھابی اسے بڑی مشکل سے یقین دلاپائی کہ اس کی عزّت پر آنچ نہیں آپائی۔

اونکار نے بھابی کو بتایا کہ یہ سب منصوبہ بند سازش تھی۔ یادو ناساب پر کوئی حملہ نہیں ہوا تھا۔ ان کے گاؤں پہنچنے سے

پہلے ہی وہ آدمی راستے میں کسی کام کا بہانہ کرکے دوسرے راستے پر ہولیا تھا۔ میں بھی ان کے گاؤں تک نہیں گیا تھا، گاؤں کے باہر یادو ناساب کی خیریت مل گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی اور چکر ہے، وہیں سے بھاگا بھاگا آرہا ہوں۔

اونکار نے محسوس کیا کہ وہ اگر چاہے تو جاسوسی اپنیاس (ناول) لکھ سکتا ہے لیکن بھابی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ لوگ بڑکی کو بھی اُٹھالے گئے۔ سامنے والی لڑکی کو۔"

"آخر وہ کون لوگ تھے اور انہوں نے ایسی ہمت کیوں کی۔ گھر میں چوری بھی نہیں ہوئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" اونکار نے سر پر ہاتھ رکھ کر بھابی کے سامنے نوٹنکی کی۔

صبح سب سے پہلے کمہار کی بیوہ اور چھوٹی بیٹی گاؤں میں داخل ہوئیں جنھیں رگھوبیر باغ والے نے ٹیوب ویل کے کمرے سے آزاد کیا تھا۔ ان دونوں نے بڑکی کو جھونپڑے میں پاکر اوپر والے کا شکر ادا کیا۔

بھابی نے تینوں کو بلا کر پوچھا۔ "یہ سب کیا چکر تھا؟" تینوں آنکھیں پھاڑے بھابی کو دیکھتی رہیں۔

نو بجے تک پولیس رپورٹ کردی گئی۔ رپورٹ اونکار نے کی تھی کہ بڑکی کے ہونے والے پتی کے کچھ دوستوں نے یہ سب حرکت کی ہے تاکہ اس کا پتی شادی سے پہلے ہی اس کا استعمال کرسکے۔ واقعات کے تانے بانے اس طرح بٹھائے گئے کہ کیس خاصا جان دار لگنے لگا۔ کم از کم چوکی کے دیوان کا تو یہی خیال تھا۔ اونکار نے موٹر سائیکل کی چوری کی رپورٹ بھی لکھائی۔ موٹر سائیکل رمیش اور راکیش کی مدد سے پھر گنّے کے ایک کھیت میں چھپائی گئی جو تیسرے دن سویرے برآمد ہوگئی۔ بڑکی کا میڈیکل ہوا جس میں طرح طرح کی ایذارسانی کے بعد عصمت دری ثابت ہوئی۔ کمہار کی چھوٹی بیٹی کا بھی میڈیکل ہوا لیکن اس کی رپورٹ ٹھیک آئی جس پر گاؤں والوں نے ڈاکٹروں کی ملی بھگت کا الزام لگایا۔

بڑکی کا ہونے والا پتی کالج سے آتے وقت گرفتار ہوا۔ حوالات ہی سے اس نے اعلان کردیا کہ اس کی سگائی اب ٹوٹی سمجھی جائے۔ وہ میڈیکل رپورٹ کے بارے میں سن چکا تھا۔ البتہ وہ چھوٹی لڑکی سے شادی کرسکتا ہے، اس نے اپنے ماں باپ کو یہی کہہ کر ڈھارس دی۔ اس کے ماں باپ نے اس کا پیغام کمہار کی بیوہ تک پہنچایا۔

کمہار کی بیوہ کے چھپّر کے اندر بڑکی بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ برابر میں اس کی بہن چھٹکی انٹر پاس دولھا کے خیال میں

ارذل

ہندو مذہب میں دینی تعلیم و تعلّم پر صرف ایک گروہ برہمن کی اجارہ داری تھی اس لیے اس تین ہزار سالہ قدیم مذہب کے سارے مصنفین برہمن تھے۔ چار وید، کئی اپنشد، چھ شاستر اور اٹھارہ پرانوں پر مشتمل ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ رامائن اور مہا بھارت رزمیہ داستانیں ہیں۔ عوام کا مذہب پرانوں اور ان دو رزمیہ داستانوں پر مبنی ہے۔

آریہ قوم نے ہندوستان کے شمالی زرخیز علاقوں پر قبضہ کیا تو قدیم باشندوں کو بھیل، گونڈ اور دوسرے دراوڑ، کالے رنگ کی اقوام کو دکن اور مشرقی بھارت کے دور دراز پہاڑوں اور جنگلات سے پٹے علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور کیا، جو بچ رہے انہیں شودر یعنی غیر آریہ قوم قرار دیا۔ سنسکرت میں 'ورن' رنگ کو کہتے ہیں۔ ان کالے رنگ والے شودروں کو مذکورہ ساری کتابوں نے نچلی ذات قرار دیا جب کہ گورے رنگ والے برہمن، سرخی مائل رنگت والے کشتری، زردی مائل رنگت والے ویشیہ تینوں آریہ گروہ اونچی ذات والے کہلائے۔

کالے نیچ ذات والے اچھوت کہلائے۔ جنہیں محض چھونے سے بڑی ذات کا آدمی ناپاک ہوجاتا ہے۔ آبادی کی اکثریت آج بھی شودروں پر مشتمل ہے۔ یہ اچھوت عام کنویں سے پانی نہیں لے سکتے، مندر میں داخل نہیں ہوسکتے، ان کے ہاتھ کا کھانا اور پانی بڑی ذات والے استعمال نہیں کرسکتے، یہ کھانے پینے کی اشیا فروخت نہیں کرسکتے، کوئی دھوبی ان کے کپڑے نہیں دھوتا، کوئی نائی ان کی حجامت نہیں بناتا۔ یہ آبادی سے دُور جنگل یا گندے علاقوں میں رہتے ہیں۔ بڑی ذات والوں کے محلے میں آباد نہیں ہوسکتے۔ اُردو زبان میں انہیں پست اقوام کہا جاتا تھا۔ حیدرآباد دکن کی مجلسِ اتحادالمسلمین نے ان کا نام پست کردہ اقوام رکھا یعنی وہ لوگ جنہیں ہندو مذہب نے پست کرکے رکھا تھا۔

ہندوستان میں ذات پات کے نظام پر منڈل کمیشن رپورٹ،

ترجمہ اسماعیل آزاد۔ بہ شکریہ ساحل کراچی

مگن سامنے کھڑے گدھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ماں کچے برتن احتیاط سے اُٹھا اُٹھا کر ایک دوسرے پر جمارہی تھی۔ سامنے گڑھی کے دروازے سے گڑھی کا صحن نظر آرہا تھا جہاں نیلا کھڑا اپنے کانوں کی نوکوں کو ہَوا کی سمت میں ٹیون کررہا تھا۔ بڑکی اچانک سوچتے سوچتے ہنسنے لگی۔ اس کی بہن نے اسے اچنبھے سے دیکھا، "کیوں ہنسی بڑکی؟"

"بس ایسے ہی۔"
"بتانا؟"
"میں سوچ رہی تھی، میری سہاگ رات اپنے ہی گھر میں ہو گئی۔" بڑکی یہ کہہ کر پھر ہنسی۔ چھٹکی خاموش ہو گئی۔

سامنے جیپ آکر رکی اور نمبر دار اُودَل سنگھ اترے۔ تیر کی طرح سیدھے اندر گئے۔ کمرے کے باہر کھڑے ہو کر کھڑکی کے راستے بہو سے تسلی کے کچھ جملے کہے۔ او نکار کو بلا کر حالات کا براہِ راست علم حاصل کیا اور پہرے کے نوکروں کو بلا کر جوتے لگوائے۔ جوتے کھا کر انہوں نے اقرار کیا کہ وہ اس رات اس لیے سو رہے تھے کہ جب سے نیلا بڑا ہوا ہے وہ گڑھی میں چور تو چور، پڑوسیوں تک کو نہیں آنے دیتا اسی لیے انہیں کوئی ڈر نہیں تھا کہ نیلے کے ہوتے ہوئے کوئی ایسی ہمّت کر سکے گا۔

شہر سے قصبے اور قصبے سے دیہات تک آنے میں اُودَل سنگھ نے صرف اس بات پر غور کیا تھا کہ علاقے میں کس کی اتنی مجال ہوئی کہ ان کی گڑھی میں داخل ہو کر ان کی بہو کو باندھ کر پناہ لینے والی لڑکی کو اُٹھا سکتا ہے۔ اس بات پر انہوں نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ نیلے کے ہوتے ہوئے یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی انہوں نے خود کو اندر سے بہت کم زور محسوس کیا۔ کیا نیلا چوکی داری کے کام میں نکمّا ہو گیا؟ کیا واقعی یہ نکمّا ہو گیا؟ انہوں نے باہر آکر نیلے کے پاس کھڑے ہو کر اسے بہ غور دیکھا۔ وہ ان کا ہاتھ چاٹنے لگا۔ آج اُودَل سنگھ کو اس پر پیار نہیں آیا۔ اس کی زبان کے کانٹے ان کے ہاتھ میں چبھے۔ انہوں نے اس کا منہ پکڑ کر ایک طرف کر دیا اور اندر آکر دالان میں خاموش لیٹ گئے۔

اس کا مطلب ہے، اب کوئی بھی گڑھی یا حویلی میں داخل ہو کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے، میں اب پھر گڑھی اور حویلی کی حفاظت کی پابندی میں پھنس جاؤں گا۔ اس کا مطلب ہے، اس نیلے کو پالنا بیکار گیا۔"

او نکار، باپ کو خاموش دیکھ کر ان کے پاس آگیا اور مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ "یہ کام کمہار کے جمائی کا نہیں ہو سکتا۔" انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ او نکار سمجھا، باپ سوال کر رہا ہے۔ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "پتا جی! ہو نہ ہو اس کے کسی ناتے دار کا کام ہے۔ وہاں اتنی رات کو کمہار کے گھر آکر کوئی انت جگہ کا آدمی ایسی ہمّت نہیں کر سکتا۔"

"تم نے رپورٹ کیوں لکھائی؟ میرے آنے کی راہ تو دیکھتے۔" او نکار چپ رہا۔ "رپورٹ سے بدنامی بھی تو ہوئی۔"

"بدنامی تو نہیں، بھابی کو کسی نے کچھ، مطلب غنڈوں نے کچھ نہیں کیا۔" حالاں کہ وہ ان کی گردن کے نیچے ایک موٹا سا نیل کا نشان دیکھ چکا تھا۔

"بہو کی بات نہیں گدھے، اصل بات یہ ہے کہ لوگ اب گڑھی میں گھسنے سے ڈریں گے نہیں۔ میں ہوتا تو نہ رپورٹ ہوتی نہ بڑکی کا رشتہ ٹوٹتا۔"

"پھر غنڈوں کا پتہ کیسے چلتا؟"

"اب چل گیا کیا؟" انہوں نے غرّا کر پوچھا۔ تھوڑی دیر بعد او نکار اُٹھ گیا۔

اُودَل سنگھ بے چینی سے کروٹیں بدلتے رہے۔ اچھی خاصی ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ بہو نے رضائی لا کر پائنتی پر رکھ دی تھی مگر انہوں نے اوڑھی نہیں۔

باہر آکر دیکھا تو نیلا زمین پر بیٹھا، بھُوسے کا ایک چھوٹا سا ڈھیر لگ رہا تھا۔ انہیں نیلے سے اچانک بیزاری سی محسوس ہوئی۔ گڑھی کے دروازے میں بڑکی داخل ہوئی اور سیدھی بہو کے پاس چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد بہو گھونگٹ کاڑھ کر بڑکی کا ہاتھ پکڑ کر ان کے پاس آئی۔ "یہ کہتی ہے کہ جس آدمی نے اس کی ماں کو جھوٹے حادثے کی خبر دی تھی، وہی آدمی گڑھی میں بھی آیا تھا۔ یہ اُسے آواز سے پہچانتی ہے اور جب وہ اِسے باندھ رہا تھا تو اس نے اس کی صورت بھی دیکھی تھی۔"

"کیا اسی نے اس کی عزّت لوٹی؟"

"نہیں، وہ کوئی اور تھا۔" بہو نے دھیرے سے جواب دیا۔

"اس کا قد کاٹھی؟"

بڑکی نے نظر نیچے کر کے اس آدمی کا حلیہ بتایا اور بتایا کہ اس کے ماتھے پر گھاؤ کے دو نشان تھے۔ بہو نے بھی سر ہلا کر اس کی تصدیق کی۔

"تو نے اس آدمی کو بھی دیکھا جس نے تیرے ساتھ چھیڑ خانی کی تھی؟" اُودَل سنگھ نے گاؤں کی لڑکی سے ذرا نرم الفاظ استعمال کیے۔

"نہیں بابو جی! میری آنکھوں پر پٹّی تھی۔" وہ آہستہ آہستہ سسکنے لگی۔ بہو اسے لے کر اپنے کوٹھے میں چلی گئی۔

ٹھاکر اُودَل سنگھ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ انہیں رہ رہ کر نیلے کے نکمّے پن پر تاؤ آرہا تھا۔

شام کو سورج ڈوبنے کے بعد وہ قصبے کی طرف چلے گئے۔ حویلی میں بھی انہیں ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے تھانے دار صاحب کو ناشتے پر بلایا۔ اسے آنے میں دیر ہوئی تو ان سے صبر نہیں ہو سکا۔ املی کے درخت کے نیچے ایک میز اور تین کرسیاں پڑی تھیں۔ تھانے دار نے اُٹھ کر ان کا استقبال کیا اور پھر وہ رجسٹر غور سے پڑھنے لگا جس میں پڑھنے کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی کیوں کہ سارے اندراجات اس نے اپنے ہاتھ سے کیے تھے۔ تھوڑی دیر مصروف رہنے کے بعد اس نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔ "نمبر دار جی! کیا پیو گے، چائے یا کافی؟"

"اماں چھوڑیے چائے کافی، آپ ناشتے پر نہیں آئے؟"

تھانے دار نے علاقے کے چوروں، ڈاکوؤں اور غنڈوں کو ماں کی ایک ہی گالی میں باندھتے ہوئے انہیں بتایا کہ پولیس کو کچھ کاغذی کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

انہوں نے رازداری کے انداز میں تھانے دار کو بتایا کہ جو غنڈے گڑھی میں داخل ہوئے تھے، ان میں ایک کے ماتھے پر زخموں کے دو نشانات تھے۔ وہ کل ملا کر تین تھے لیکن گڑھی میں صرف دو آئے تھے حالاں کہ اصلی کام تیسرے نے کیا تھا۔

تھانے دار نے کچھ پرانے رجسٹر نکالے۔ بڑے منشی کو بلا کر سرگوشیاں کیں۔ ایک دو سپاہیوں کو ہم راز بنایا۔

"آپ شام کو تکلیف کرو تو میں ایسے تین چار لوگوں کو حاضر کر سکتا ہوں۔"

شام کو جب وہ دوبارہ تھانے آئے تو اس وقت بجلی چلی گئی تھی۔ بڑی بڑی دو لالٹینیں جل رہی تھیں اور ان لالٹینوں کی روشنی میں تین لونڈے ڈنڈے کھا رہے تھے۔ تھانے دار نے انہیں بتایا کہ "یہ گل فام کنجڑے کا بڑا بھائی ہے جمعراتی۔ یہ رام چندر تیلی کا داماد ہے للّو اور یہ ہے کلو پہلوان کا لونڈا ونود، اب آپ پہچانیے۔"

نمبر دار اُودَل سنگھ شش و پنج میں پڑ گئے تھے۔ تھانے کے پھاٹک پر لونڈوں کے عزیز رشتے دار آکر جمع ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ لوگ قصبے کے مقامی وکیلوں کو لے کر آئے تھے۔ تھانے دار صاحب نے وکیل حضرات کو کرسیاں پیش کیں۔

اتنے میں حویلی سے نوکر نے آکر اُودَل سنگھ سے کہا کہ انہیں ترنت حویلی میں بلایا گیا ہے۔

وہ فوراً جیپ میں بیٹھ کر حویلی پہنچے۔ وہاں بھی بجلی نہیں تھی۔ بڑے پھاٹک میں داخل ہو کر جیسے ہی وہ صحن میں آئے، ایک آدمی نے اندھیرے سے نکل کر ان کے پیر پکڑ لیے۔ وہ اس کی شکل نہیں دیکھ سکے۔

"کون ہے؟ ابے کون ہے؟ کیا بات ہے، کیا میّا مر گئی؟"

"ایسے ہی سمجھو بابو جی! صبح سے پولیس دو دفعہ دوِش دے

چکی ہے۔"

وہ ان کا پیر پکڑے پکڑے دالان تک آیا جہاں لالٹین جل رہی تھی۔ اُودَل سنگھ بھی ڈیڑھ ٹانگ سے چلتے ہوئے آئے اور لالٹین کی روشنی میں دیکھا کہ جو آدمی ان کے پیر پکڑے ہوئے تھا، اس کے ماتھے پر گھاؤ کے دو نشان واضح تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ تھانے میں پہنچے اور انہوں نے گل فام کے بڑے بھائی جمعراتی کی نشان دہی کی کیوں کہ وہ امرودوں والے واقعے کے بعد اُودَل سنگھ کے پورے خاندان کا دشمن ہوگیا تھا۔ باقی دو چھوڑ دیے گئے۔ جمعراتی کے وکیل محمد عمر نے جمعراتی کو کونے میں لے جاکر سمجھایا، وہ جُرم قبول کرلے تاکہ حوالات کی مار سے بچ سکے۔ ضمانت ہوجائے گی۔ پورا معاملہ دو ہزار میں طے ہوا۔

ٹھاکر اُودَل سنگھ قصبے میں نہیں رُکے۔ ان کے چہرے پہ سرخی چھلک آئی تھی جیسے کئی گلاس بھر کے تاڑی پی لی ہو۔ وہ دگڑے پر تیزی سے جیپ چلاتے ہوئے گاؤں پہنچے۔ رات ہوچکی تھی۔ گڑھی کا دروازہ نوکروں نے کھولا۔ سامنے سے نوکر ہٹے تو ان کے پیچھے نیلا کھڑا تھا۔ اُودَل سنگھ نوکروں کو گالیاں دیتے ہوئے نیلے سے لپٹ گئے۔ وہ ان کی گردن اپنی کانٹوں والی زبان سے چاٹتا رہا جو اس وقت اُودَل سنگھ کو پھولوں کی پنکھڑیوں کی طرح نرم لگ رہی تھی۔

اونکار کو جگایا، اسے کوٹھے میں بلایا۔ جب اونکار آدھے گھنٹے بعد باہر نکلا تو پہرے کے نوکروں نے اسے قریب سے دیکھا۔ اس کے گال پر انگلیوں کے پانچ نشان بہت واضح تھے مگر وہ چہرے سے خوش اور مطمئن لگ رہا تھا بلکہ ایک نوکر نے اسے آہستہ آہستہ ہنستے ہوئے بھی سنا۔ اونکار کے سینے پر ایک ہلکا بوجھ تھا تو گال کے ایک چانٹے میں اُتر گیا تھا۔

صبح اُٹھ کر اُودَل سنگھ نے آدھ سیر کھوئے کے پھیکے پیڑے بنا بنا کر نیلے کے منہ میں ڈالے اور آدھا سیر سرسوں کا خالص تیل پلایا۔ پیڑے کھا کر اور تیل پی کر وہ اُچھلنے لگا اور پھر چلا تو ایسے چلا کہ عام طور پر نیلے اس طرح نہیں چلتے۔

گاؤں کے پرائمری پاٹھ شالا کے بوڑھے ہیڈ ماسٹر نے جو باقی تین ماسٹروں کا کام بھی خود دیکھتے تھے، اس بات پر حیرت کی کہ نیلا کھویا کھاتا ہے اور سرسوں کا تیل پیتا ہے۔ "اس پر کار کی کھاد سے جنگل کا جانور اندر سے بگڑ جاتا ہے۔"

ٹھاکر اُودَل سنگھ نے ان کی بات سنی ان سنی کرکے جیپ اسٹارٹ کی اور ڈیزل کا دھواں ہیڈ ماسٹر کے چہرے پر دیر تک ناچتا رہا۔

نیلا اور زیادہ تگڑا ہوگیا تھا۔ پورا دھڑ سیاہ ہوچکا تھا اور سینگ موٹے ہوگئے تھے۔ اب وہ آزادی سے کسی کی مدد کے بغیر گاؤں سے قصبے اور قصبے سے گاؤں تک آپ ہی آپ چلا جاتا۔ راستے میں فصل کے اندر سے ہوکر آنے میں اسے خاص لطف ملتا، فصل بڑی ہو تو زیادہ نقصان نہیں ہوتا تھا لیکن اگر چھوٹے چھوٹے پودے ہوتے تو نیلے کے کھروں کی پوری پگ ڈنڈی بن جاتی اور اس حصّے کی فصل بری طرح ماری جاتی۔

کسانوں نے ایک آدھ بار دبی زبان سے شکایت کی۔ اُودَل سنگھ ان کی تالیفِ قلب کے لیے کہہ دیتے کہ میں اسے سمجھا دوں گا، جس وقت وہ یہ کہتے، انہیں یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ ایک جانور کے بارے میں ایسا کہہ رہے ہیں۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ جو لوگ یہ سنتے، انہیں بھی احساس نہ ہوتا کہ یہ بات ایک جانور کے بارے میں کہی جارہی ہے۔

دیوالی انہوں نے اپنے خاندان کے ساتھ شہر میں منائی۔ دیوالی کے دوسرے دن رات کو وہ سب اپنی کوٹھی میں بیٹھے تھے۔ ہلکا ہلکا جاڑا تھا لیکن بالکل اندھیری تھی۔ آسمان پر چھوٹے چھوٹے مدھم تارے چمک رہے تھے۔ کوٹھی کے گیٹ پر کچھ آہٹ ہوئی۔ نوکر نے پاس جاکر دیکھا اور پوچھا۔ "کون؟ کون ہے؟"

باہر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی تیز تیز سانسیں لے رہا ہو۔ نوکر ڈر گیا۔ بھاگ کر اندر آیا۔ ہانپتے ہوئے بولا۔ "باہر کوئی ہے، آواز کا جواب نہیں دے رہا ہے۔"

سب کے چہروں پر ہلکا ہلکا ہراس پھیل گیا۔ اُودَل سنگھ اپنے دونوں بیٹوں، بندوقوں اور ٹارچوں کے ساتھ گیٹ پر آئے۔ بندوق کندھے پر رکھ کر گیٹ کھلوایا۔ اندھیرے میں کوئی تیز تیز سانسیں لے رہا تھا۔ ٹارچ جلائی۔ گھنے اندھیرے میں ٹارچ کی مریل روشنی کا دائرہ اس پر پڑا جس کا رنگ سیاہ تھا اور جس کے سینگ موٹے تھے۔

"ارے۔" سب کو بے حد حیرت ہوئی۔

ٹھاکر اُودَل سنگھ کسی سوچ میں پڑگئے۔ نیلے کو شہر کا راستہ تو بتایا ہی نہیں گیا تھا۔ یہ اپنے آپ کیسے آگیا؟ پھر بھی انہیں دل ہی دل میں بہت خوشی محسوس ہوئی جیسے نیلے کا یہ کارنامہ ان کی ذاتی کارکردگی ہو۔

"اس کا اس طرح آنا ٹھیک نہیں ہے۔" پرتاپ بولا۔ "شہر میں نقصان کرے گا تو مشکل ہوجائے گی۔"

"کوئی بات نہیں، اسے سمجھا دیں گے۔" اُودَل سنگھ خوشی سے بولے۔ اونکار نے بھی نیلے کی پیٹھ تھپ تھپائی۔

رات بھر نیلا لان کے پھول کھوندتا رہا اور منی پلانٹ کی بیلیں کھاتا رہا۔

صبح سب سے پہلے مالی نے یہ نقشہ دیکھا اور زور زور سے نیلے کو گالیاں دینے لگا۔ اُودَل سنگھ آنکھیں ملتے باہر آئے اور پھولوں اور بیلوں کا حشر اور مالی کو غصّے میں دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اونکار بھی ان کے پیچھے کھڑا ہنس رہا تھا۔ بڑکی کے واقعے کے بعد وہ باپ کی زیادہ چمچاگیری کرنے لگا تھا۔

بڑی مشکل سے نیلا قصبے لایا گیا اور پھر قصبے سے دیہات پہنچایا گیا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے جب یہ واقعہ سنا تو انہوں نے بتایا۔ "جب پراکرتی کے خلاف کھان پان ہوتا ہے تو بھیجے کی آکرتی بگڑ جاتی ہے اور کچھ ایسی بھی شکتیاں پیدا ہوجاتی ہیں جو جانور میں پیدائشی طور پر نہیں ہوتیں۔"

معلوم نہیں، یہ بات کہاں تک صحیح تھی لیکن اتنا ضرور تھا کہ نیلے سے اب مویشی بھی ڈرنے لگے تھے، سانی کھاتے بیل اسے دیکھ کر رسّیاں تڑانے لگتے اور تھان پر بندھے گھوڑے اسے پاس آتا دیکھ کر بجائے اس کے کہ اگلے پیر اُٹھا کر حملہ کریں، پچھلے پیر اُٹھا اُٹھا کر کودنے لگتے۔ گڑھی کے سامنے بندھے کمہار کے گدھے تو اسے دیکھتے ہی ایک دوسرے کے پیٹ کے نیچے گھسنے لگتے۔ وہ ان سب سے بے نیاز اینڈتا، برتا اپنے راستے چلتا رہتا۔ اپنے راستے چلنے سے مراد یہ کہ پڑوس کے گھروں میں گھس کر برتن بھانڈے توڑتا، پاٹھ شالا میں جاکر ہیڈ ماسٹر صاحب کی کرسی اُلٹ دیتا اور ننھے ننھے بچوں کو سینگوں سے ریلتا دھکیلتا رہتا۔ وہ اب تک آٹھ بچوں کو زخمی کرچکا تھا۔ ٹھاکر نے ان بچوں کے والدین کو بھری پنچایت میں سمجھایا کہ یہی آٹھ بچے نیلے کو پتھر مار مار کر پریشان کرتے ہیں۔ ورنہ ڈیڑھ سو بچوں میں وہ صرف انہی آٹھ کو کیوں پسند کرتا۔ باقی بچوں کے والدین نے اپنے اپنے نیک بچوں کا خیال کرکے اطمینان کی سانس لی اور ان آٹھ بچوں کے والدین کو دیر تک سمجھاتے رہے کہ بے زبان پشو کو چھیڑنا کتنی بری بات ہے۔

✲ نیلے نے ایک دن صبح ہی صبح ہرا چارا کھا کر سرسوں کا تیل پیا۔ ٹھاکر نے آج اسے مونگ پھلی کے دانے بھی دو مٹھی بھر کے کھلائے۔ نیلا اُچھلتا ہوا گڑھی کے دروازے کے باہر گیا۔ تھوڑی دیر میں شور اُٹھا کہ نیلے نے کھیتوں میں گیہوں کی نرائی کرتی بھیکو کی جوان بہو کی آنتیں ایک ہی ٹکّر میں باہر نکال دی ہیں۔ ٹھاکر، جیپ میں بھیکو کی بہو کو ڈال کر فوراً شہر کے اسپتال پہنچے۔

آپریشن کرا کے دو ہفتے بعد گاؤں لائے تو گاؤں والوں نے تیسرے دن پنچایت کا نیوتا دیا۔

اُودَل سنگھ بھی پنچایت میں موجود تھے۔ پچھلے دو دن وہ گاؤں کے واحد مندر کے پجاری کے پاس رات کو دیر تک بیٹھے رہے تھے۔

پنچایت میں پنچوں کے پاس ٹھاکر بھی کرسی پر جمے بیٹھے رہے لیکن انہوں نے سر جُھکا رکھا تھا۔ بھیکو کے لونڈے نے بڑی تیز آواز میں نیلے کی شکایت کی تھی اور پنچوں سے کہا تھا کہ اسے جنگل میں چھوڑنے کا تُرنت پربندھ (انتظام) کیا جائے۔ اُودَل سنگھ کچھ دنوں سے محسوس کررہے تھے کہ کچھ برادریاں ان سے خاص طور پر بہت جلنے لگی ہیں۔ بھیکو کی برادری بھی انہی میں سے تھی لیکن اس وقت وہ چپ رہے۔ مندر کے پجاری بھی آکر کھڑے ہوگئے تھے۔ انہیں دیکھ کر پنچوں نے اور کئی لوگوں نے کھڑے ہوکر ڈنڈوت کی اور پجاری جی کو برگد کے گھیرے میں بڑے مونڈھے پر بٹھایا۔

سرپنچ ادھیکاری لال کو اُودَل سنگھ ہی نے سرپنچ بنوایا تھا۔ وہ اس وقت بڑے شش و پنج میں تھا۔ فیصلہ کرنے سے پہلے اس نے پنچوں سے کچھ مشورہ کیا۔ پھر تھوڑی شرمندگی اور کھسیاہٹ کے ساتھ اس نے اُودَل سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "نمبردار! آپ تو جانتے ہی ہیں، ہم سب لوگ آپ کے جانور سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ پر اب اس کا کچھ پربندھ کرنا آپ بھی ضروری سمجھتے ہوں گے کیوں کہ پچھلے مہینے اس نے اسکول کے آٹھ بچّے زخمی کیے اور بھیکو کی بہو کا پیٹ پھاڑ دیا۔ آپ اس

بارے میں کیا وچار رکھتے ہیں ؟"

وہ اگہن کا آسمان تھا اور اگہن کا آسمان نیلا ہوتا ہے۔ وہ ایسا موسم تھا کہ جاڑا تیز ہونا شروع ہو جاتا ہے اس لیے اس موسم میں جاڑا تیز ہونا شروع ہو گیا تھا۔ سب بڑے برگد کے نیچے بیٹھے تھے کیوں کہ اتنی بڑی پنچایت کے لیے گھر چھوٹا پڑتا تھا۔ برگد پر بہت سے پرندے بیٹھے تھے اور بہت شور مچا رہے تھے کیوں کہ پرندے برگد پر بہت شور مچاتے ہیں۔ ٹھاکر خاموش تھے کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ کبھی کبھی خاموش رہنا بولنے سے زیادہ چیختا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ سر جھکائے بیٹھے تھے کیوں کہ اس پوز کے بھی کچھ خاص فائدے ہیں۔ اس وقت اچانک پنچوں نے بولنا بند کر دیا۔ سارے میں سنّاٹا چھا گیا۔

جب اُودَل سنگھ نے محسوس کر لیا کہ اب سنّاٹا اتنا گہرا ہو گیا ہے کہ ایک دھیما سا بول بھی اسے کتر کے پھینک دے گا تو انہوں نے مضبوط اور دُکھی لہجے میں فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں تو صرف پشو کی سیوا کرنا اپنا دھرم سمجھتا تھا۔ پر آپ لوگ اگر آدیش دو تو میں اسے ابھی، ابھی گولی مار دوں۔" وہ رُک کر بڑے زور سے چلّائے۔ "رام دین! بندوق اُٹھا کر لا، ایل جی کے چار کارتوس بھی۔"

پوری پنچایت کانپ اُٹھی۔ پنچوں کے سر اپنی گود میں چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ سنّاٹا پھر چھا جائے، ایک کڑک دار آواز ابھری۔ "کیا بکتا ہے مورکھ، گئوبدھ کا شراپ گاؤں پر ڈالے گا۔"

یہ پجاری کی آواز تھی جو مونڈھے سے کھڑے ہو کر غصّے سے کانپ رہے تھے۔ انہوں نے سمرتیوں سے ثابت کیا کہ نیلا بھی دراصل گئوماتا کے خاندان کا جانور ہے۔ اس کی ٹانگیں، اس کے کھر، اس کے سینگ سب ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے گائے کے۔ انہوں نے بتایا کہ اگر گئوبدھ ہوا تو گاؤں میں پہلے تو ہیضے کی وبا آئے گی جو خاص طور سے گود کے بچّوں کو چن چن کر لے جائے گی۔ (ماؤں نے ننھے ننھے بچّوں کو سینے سے لپٹا لیا) پھر تیز موسلا دھار بارش ہو گی اور کھیتوں کے پودے جڑ سمیت نکل کر اسی سیلاب میں بہہ جائیں گے۔ (مَردوں نے اچک اچک کر اپنے اپنے کھیتوں کی اور دیکھا) پھر آندھیاں آئیں گی اور درخت یعنی برگد جیسے بڑے ورکش بھی اپنی جٹائیں سمیٹ کر دھرتی سے نکل کر زمین پر بچھ جائیں گے۔ (پوری پنچایت نے سہمے سہمے انداز سے برگد کے درخت کی طرف دیکھا) پھر رات کو بیئے تال آئیں گے اور گئوبدھ کرانے والوں کے گلے میں دانت گاڑ کر سارا رکت پی جائیں گے۔ (پوری پنچایت نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیر کر ہاتھوں کو دیکھا۔ خون کا نشان نہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی) اب بولو، کون کرائے گا گئوبدھ۔ اُودَل سنگھ! آخر تو سارے گاؤں پر یہ آفت کیوں ڈالنا چاہتا ہے۔ بول ؟"

نمبر دار اُودَل سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر بنتی کی۔ "مہاراج! میں پنچوں کے آدیش کا سیوک ہوں۔ میں گاؤں بھر کی بات سے الگ نہیں جا سکتا۔"

مہاراج جو اَب تک مجمع پڑھ چکے تھے، چیخ کر بولے۔ "گاؤں میں کون ہے جو نیلے کو مارنے کی بات کہہ رہا ہے۔" سنّاٹا چھا گیا۔

"مارنے کی بات نہیں مہاراج جی! ہم کہتے ہیں کہ اسے جنگل میں چھوڑ دیا جائے۔" بھیکو کا لونڈا کھڑا ہو کر منمنایا۔

"جنگل میں چھوڑ دیا جائے۔ یہاں جنگل کہاں ہیں۔ میدان ہی میدان ہیں۔ اگر کسی مُسلے نے پلے پلائے نیلے کو گولی مار دی تو بدھ کی ذمّے داری گاؤں پر سے ہٹ جائے گی کیا؟ بولو، جواب دو۔"

ٹھاکر اُودَل سنگھ سر جُھکائے حساب لگاتے رہے کہ پجاری جی نہ صرف یہ کہ مشورے کے مطابق خیالات دہرا رہے ہیں بلکہ تقریباً انہی الفاظ میں جن کی ریہرسل پچھلی دو راتوں سے ہو رہی تھی۔

"میدان میں کتنے جنگلی نیلے بھاگتے رہتے ہیں۔ کبھی اس کھیت میں، کبھی اس کھیت میں۔ کبھی اُس کا گیہوں چکھا، کبھی اُس کی ارہر پر منہ مارا۔ ان میں سے کسی کو تم نے مارا۔ جواب دو۔"

"للکار تو دیتے ہیں، بھگا تو دیتے ہیں۔" بھیکو کا لونڈا آسانی سے ہار نہیں مان رہا تھا حالانکہ زور ٹوٹ رہا تھا۔

"تو اسے بھی للکار دیا کرو، یہ تو انسانوں میں پلا ہے۔ للکار فوراً سمجھ لے گا۔"

نیلا گڑھی کے دروازے سے منہ نکالے پنچایت کا منظر دیکھ رہا تھا۔ پجاری نے اسے ایک نظر دیکھ کر رام لیلا والے انداز میں کہا۔ "بے زبان پشو نے دور سے منشوں کو دیکھا اور اپنے بارے میں ان کی زبان سے بدھ کی بات سن کر ایشور سے کہا کہ ہے بھگون! میں کہاں آپھنسا ہوں۔ ہے بھگون! میں کہاں آپھنسا ہوں۔ ہے بھگون! میں کہاں آپھنسا ہوں۔"

پوری پنچایت نے کھڑے ہو کر گڑھی کے دروازے سے سر نکالے نیلے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس بات کا پورا یقین کیا کہ نیلے نے ابھی ابھی آسمان کی طرف دیکھ کر ایشور سے یہی بات کہی ہے۔ سب کے من بھاری ہو گئے اور سر لٹک کر سینے پر آ گئے۔

اُودَل سنگھ نے دل ہی دل میں پجاری کو داد دی کہ یہ آخری ٹکڑا مشورے کے مطابق نہ ہونے کے باوجود بڑا اثر دار تھا۔

پنچوں نے تھوڑی دیر بعد اپنا فیصلہ سنایا۔ "سبھی لوگوں

زعفراں زار

☆ جب تک آدمی میچور ہوتا ہے اس کی شادی ہو چکی ہوتی ہے۔
☆ جس چیز کو سرکاری سرپرستی حاصل ہو، اُسے کہیں اور سے نقصان پہنچانے کی ضرورت نہیں۔
☆ انگریزوں میں سب سے بڑی برائی یہ ہوتی ہے کہ وہ کم بخت انگریز ہوتے ہیں۔
☆ ہمیں تاریخ میں بہت دل چسپی ہے، مہینے کی پہلی تاریخ میں۔
☆ کام یاب ٹیچر وہ ہے جو کلاس بھی پڑھائے اور اسٹوڈنٹس مطمئن بھی ہو جائیں۔
☆ ہمارے ہاں کسی خاتون کا شعر کہنا بڑی بات نہیں، اپنے شعر کہنا بڑی بات ہے۔
☆ ہر کام یاب مرد کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے اور کام یاب عورت کے پیچھے بہت سے مرد۔

عطا اللہ عالی کی تخم ریزیاں

سے بنتی ہے کہ نیل گائے کو کچھ نہ کچھ کھلاتے رہنا چاہیے۔ جب بھی وہ ان کے پاس سے گزرے تو اسے کچھ کھانے کو دے دیں۔ اگر وہ سینگ سامنے کر کے آئے تو اسے للکار کر ایک طرف ہٹ جائیں۔ گئوبدھ کے بارے میں کوئی بات دھیان میں نہ لائیں، اس سے شراپ لگتا ہے۔"

پنچایت جب چھٹی تو سبھی لوگ اُودَل سنگھ کے شکر گزار تھے جنھوں نے آج نیلے کو گولی نہ مار کر سارا گاؤں مختلف آفتوں سے بچالیا تھا۔ ٹھاکر سر جُھکائے سب کا دھنیہ واد خاک ساری کے انداز میں قبول کرتے رہے۔ بھیکو کا لونڈا جب پنچایت سے اُٹھا تو اس کا دل مطمئن نہیں تھا مگر وہ بے بس تھا۔ اسے لگا جیسے اندر ہی اندر کوئی نم لکیر دماغ سے آنکھوں تک کھنچ گئی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھ کر اپنے گھر کی طرف چلا جہاں اس کی بیوی پیٹ پر پٹیاں باندھے چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی۔ اس نے سر اُٹھا کے گردن موڑ کر اُسے دیکھنا چاہا تو پیٹ کے ٹانکوں میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اس کا سر دھم سے چارپائی پر آرہا اور وہ ہولے ہولے سسک سسک کر کانپنے لگی۔

نیلے کی قصبے والی واردات زیادہ گمبھیر تھی۔ اس واردات کا تعلّق بھی دیہات ہی سے تھا بلکہ شاید جنگل سے تھا یا ممکن ہے دونوں سے ہو۔

ایک دن جب سورج کچھ اوپر چڑھ آیا تھا اور ہَوا میں گرمی آچکی تھی تو نیلے نے گڑھی سے نکل کر کھیتوں کا رخ کیا۔ کھیت ویران پڑے تھے۔ گیہوں کٹ کر کھلیانوں میں آچکا تھا۔ کھیتوں کے پاس پہنچ کر نیلے نے زمین پر منہ مارا۔ گیہوں کے سُوکھے پودے جو اِدھر اُدھر پڑے رہ گئے تھے، بہت بے مزہ محسوس ہوئے۔ اس نے بیزاری سے سامنے میدان کی طرف دیکھا، سامنے اس کے ہم جنس کھڑے تھے، اس نے انہیں پہلی بار نہیں دیکھا تھا۔ ایک دفعہ دو موسم پہلے وہ دو تین گھنٹوں کے لیے ان میں رہ بھی آیا تھا لیکن ان کی وحشت کا ساتھ نہیں دے پایا تھا۔ داڑھی والے سیاہ نیلے نے اسے دیکھ کر سینگ آگے کر کے پینترا بھی بدلا تھا مگر وہ اس سے محفوظ فاصلے پر کھڑا رہا تھا۔ بھوری مادائوں نے اسے پہلے حیرت پھر خوشی پھر شوق کی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس نے بھی ان میں کشش محسوس کی تھی۔ اچانک پیچھے سے کھیت والوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ داڑھی والا سیاہ نیلا زمین پر اُچھلا تھا اور مادائوں کے پیچھے تیزی سے دوڑنے لگا تھا جو اس سے بھی پہلے کان ہلا ہلا کر، دُم گھما گھما کر خطرے کا اعلان کر کے بھاگ چکی تھیں۔ نیلا اضطراری طور پر ان کے پیچھے بھاگا تھا۔ وہ پوری طاقت سے دوڑ رہا تھا مگر ان کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ اسے اتنا دوڑنے کی عادت بھی نہیں تھی۔ دراصل اسے دوڑنے کی عادت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ دوڑنے کی عادت ختم ہو جائے تو بدن کی چربی جلتی نہیں، گانٹھ بن کر رگ پٹھوں میں سما جاتی ہے اور بھاگنا تو ایک طرف، چلنے میں بھی رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اتنی باریکیاں وہ شاید نہیں سمجھ پایا تھا لیکن اتنا وہ یقیناً سمجھ گیا تھا کہ ان بھوری، دُبلی اور چلبلی مادائوں اور سیاہ داڑھی والے کے ساتھ ساتھ دوڑنا اس کے بس کی بات نہیں۔

وہ ایک کھیت میں اچانک رک گیا، دوڑتے ہوئے لونڈے اس کے پاس جا کر اسے پہچان کر اپنے ساتھ گڑھی میں لے آئے جہاں اُودَل سنگھ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اُودَل سنگھ نے اسے گُڑ کھلایا اور سرسوں کا تیل پلایا تب گانٹھوں کا درد کم ہوا۔

اس دن کے بعد سے اس نے متعدد بار اپنے ہم جنسوں کو دیکھا لیکن اسے کبھی یہ خواہش نہیں ہوئی کہ ان کے پیچھے بھاگے۔

آج وہ ایک ٹک ان کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ داڑھی والا کالا نر اور مادائیں اس کی طرف منہ کر کے ساکت کھڑے تھے۔ وہ گڑھی اور دیہات سے بہت دور، کھیت پار کر کے میدانوں میں آگیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ غیر ارادی طور پر ان کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ان سے تین چار کھیت دور تھا کہ اچانک رک گیا۔ ان ہم جنسوں کے پیچھے کوئی آدمی ہاتھ میں ایک لمبی چیز اُٹھائے چپکے چپکے ٹیوب ویل کی آڑ میں چھپتا چھپتا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ نیلا چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمیوں کے درمیان پلا تھا، اسے آدمیوں سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مادائیں ایک ایک قدم کر کے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ کالا داڑھی والا سب سے پیچھے رہ گیا تھا۔ اچانک وہ آدمی سیدھا کھڑا ہوا اور لمبی سی چیز کالے داڑھی والے کی طرف کر کے زوردار دھماکا کیا۔ کالا داڑھی والا، بھوری مادائیں اور خود وہ، سب کے سب زمین سے ایک ایک ہاتھ اوپر اُچھلے۔ کالا داڑھی والا وہیں گر پڑا اور اگلی ٹانگوں سے اُٹھنے کی کوشش کی کہ ایک اور دھماکا ہوا اور وہ زمین پر گردن ڈال کر ڈکرانے لگا۔ بھوری مادائیں کنوتیاں بدل کر دُم گھماتی ہوئی تیزی سے بھاگیں اور حدِ نظر تک دوڑتی چلی گئیں، کھو گئیں۔ اس نے دیکھا کہ کالے داڑھی والے کے بدن سے لال لال خون نکل کر زمین میں جذب ہو رہا ہے۔ وہ یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہیں اضطراری طور پر زمین پر پیر مارنے لگا۔ دو چار آدمی اس پہلے والے آدمی کے پاس بھاگتے ہوئے آئے اور جیپ لا کر داڑھی والے کو اس میں ڈال کر دُھول اُڑاتے چلے گئے۔ جس وقت وہ اسے جیپ میں ڈال رہے تھے، اس کی تھوتھنی اور پچھلی ٹانگیں زمین سے ٹکرا ٹکرا کر گھسٹ رہی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ ڈکر ڈکر کر ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس کی بے بسی کا یہ منظر دیکھ کر نیلا گھبرا کر پیچھے منہ کر کے جو بھاگا تو گڑھی میں آکر رکا اور پھر ٹھاکر اُودَل سنگھ کی چارپائی کے پاس کھڑے ہو کر خود کو دوبارہ محفوظ خیال کر کے اینڈنے لگا۔

دوسرے دن اُودَل سنگھ نے اونکار کو بتایا کہ لپٹن کمپنی والے گورے نے کل میدان میں سے ایک نیلا مارا جس پر فیکٹری کے لوگوں نے بہت لے دے کی۔ بڑی مشکل سے پولیس کو دے دلا کر معاملہ ٹالا گیا۔

ٹھاکر اُودَل سنگھ قصبے کی واردات والے دن محمود صاحب کی بیٹی کی شادی کے نیوتے میں گئے ہوئے تھے۔ نیلا بھی ان کے ساتھ ہو لیا تھا۔ محمود صاحب کی حویلی کے پاس میدان میں بڑا سا رنگین شامیانہ لگا تھا اور چاروں طرف موٹریں اور یکّے کھڑے تھے۔ شاید پورے قصبے کی دعوت تھی۔ نمبردار جیپ پر تھے اور آہستہ آہستہ چلا رہے تھے کیوں کہ نیلا بھی ان کے ساتھ ساتھ دلکی چل رہا تھا۔ شامیانے کے باہر محمود صاحب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نمبردار نے ہاتھ جوڑ کر مبارک باد دی۔ تھوڑی دیر بعد بڑے قاضی صاحب نے خطبہ پڑھا کر ایجاب و قبول کرلیا۔ دولھا نے اُٹھ کر سہرے سے منہ نکال کر سب کو سلام کیا۔ مبارک بادیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ٹھاکر صاحب نے

زعفراں زار

☆ عورتوں کو بے وقوف بنانا بہت آسان ہے کیونکہ اس کے لیے کسی کو کچھ کرنا نہیں پڑتا۔
☆ ہمارے ہاں لوگ باگ ہر وقت اس کام میں مصروف رہتے ہیں کہ کام سے کس طرح بچا جائے۔
☆ وہ صفائی کا اتنا خیال رکھتا ہے کہ صابن کی ایک پوری فیکٹری کا مالک ہے۔
☆ یہ طبعاً اتنا شریف ہے کہ کسی کو شک تک نہیں ہوتا کہ اس کا تعلق ادیبوں سے ہے۔
☆ پوش ایریا میں وہ آتے ہیں جو روپوش ہونا چاہتے ہیں۔
☆ ہمارے ہاں سب سے مضبوط وزیرِ اعظم نگراں وزیرِ اعظم ہوتا ہے اس کے پاس تین ماہ کی گارنٹی ہوتی ہے۔
☆ شادی ہمیشہ ایک سے کم ہونی چاہیے۔

عطا اللہ عالی کی تخم ریزیاں

مرغ کا سالن اور دوسروں کی نظر بچا کر بڑے کے کباب کھائے۔ انہیں براتیوں کے ساتھ ہی بٹھا دیا گیا تھا حالانکہ وہ منع کرتے رہے کہ میں تو لڑکی والا ہوں۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے بٹوے سے ۵۰۱ روپے نکال کر محمود صاحب کو مخاطب کر کے پیش کیے اور ہاتھ جوڑ دیے۔ محمود صاحب نے "اس کی کیا ضرورت تھی۔" کہہ کر لفافہ شیروانی کی جیب میں رکھا۔ ایک نوجوان براتی سہرا پڑھ رہا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے دیکھا کہ محمود صاحب کا بڑا لڑکا شامیانے کے باہر کھڑا نیلے کو گڑ کھلا رہا ہے۔ وہ اس تواضع سے خوش ہوئے۔ واپسی کی اجازت لے کر وہ رخصت ہوئے۔ نیلا ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ برات کے بہت سے لوگ بھی نیلے کو دیکھنے کی چاہ میں شامیانے سے باہر آگئے تھے۔ ٹھاکر صاحب فخر کے ساتھ جیپ میں بیٹھے۔ نیلا دلکی چلنے لگا۔ راستے میں ایک موڑ کاٹ کر انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، نیلا رک گیا تھا اور کانجی ہاؤس کے پاس طویلے میں ایک گائے کو اپنے ساتھی بیل سے راز و نیاز کرتے دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ اپنی جگہ سے اُچھلا اور تیزی سے بھاگتا ہوا جیپ سے بھی آگے نکل گیا اور راستے میں ملنے والا ہر خوانچہ کھدیڑتا، ہر آدمی کو ریلتا، ہر دکان سینگوں سے دھکیلتا حویلی کی طرف بھاگا۔ راستے میں اس نے اڈّے کی مسجد سے نکلتے ہوئے بڈھے ملّاجی پر کاری وار کیا۔ وہ جا کر سامنے کی پکّی دکان کے چبوترے سے ٹکرائے اور سر کی چوٹ کھا کر وہیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہونے لگے۔ ٹھاکر تیزی سے حویلی میں آئے اور جیپ کھڑی

کر کے دوبارہ واپس آگئے جہاں سیکڑوں آدمیوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ کیوں کہ اس دن محمود صاحب کی لڑکی کی شادی تھی اور محمود صاحب، ٹھاکر اُودَل سنگھ کے پرانے مخالف تھے اور کیوں کہ نیلے کے شکار ہونے والے ملّاجی تھے اور کیوں کہ قصبے میں بہت دن سے کچھ ہوا بھی نہیں تھا اس لیے معاملہ اتنی جلدی مذہبی رنگ میں رنگا کہ اُودَل سنگھ نمبر دار کو کسی تیاری کا موقع ہی نہیں ملا۔

محمود صاحب کے براتی بھی بازار میں آگئے تھے۔ ان کے سامنے محمود صاحب نے سبکی محسوس کی کہ قصبے میں ان کے ہوتے ہوئے اُودَل سنگھ کا نیلا ایک مسلمان کو، وہ بھی مسجد کے موذّن کو یوں مار جائے۔ تھوڑی دیر بعد نعرے لگنا شروع ہو گئے۔ "جان کا بدلا جان سے، خون کا بدلا خون سے۔" وغیرہ۔

اب ادھر بھی بھیڑ کی تیاری ہوئی۔ اونکار نے راکیش اور رمیش کو ساتوں محلّوں میں دوڑایا۔ بھیڑ چیرتا ہوا، ڈنڈا ہلاتا ہوا تھانے کا انچارج وردی پہنے آیا اور ملّاجی کو جیپ میں لدوا کر شہر کے اسپتال بھیج دیا گیا۔ بھیڑ جذبات میں بے قابو ہو رہی تھی۔ تھانے دار نے مشورہ دیا کہ تھانے چلے چلیے، آپ کے لیے اور میرے لیے وہی زیادہ محفوظ جگہ ہے۔ ٹھاکر اُودَل سنگھ جب تھانے تک بہ حفاظت آگئے اور تھانے دار کے دائیں طرف والی کرسی پر محمود صاحب کے مقابل بیٹھ گئے تو ان کے ذہن کی بیٹری نے دوبارہ کام کرنا شروع کیا۔ محمود صاحب کا اصرار تھا کہ فوراً دفعہ ۳۰۲ کی رپورٹ لکھی جائے۔ ٹھاکر خاموش بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ کبھی کبھی منہ اُٹھا کر تھانے کے پھاٹک کے باہر کھڑی بھیڑ بھی دیکھ لیتے۔ آہستہ آہستہ ان کے آدمی بھی بھیڑ کا حصّہ بنتے جا رہے تھے۔ پھر انہوں نے پرتاپ اور اونکار کو دیکھا جو اپنے ہم عمر لونڈوں کے ساتھ ایک الگ گوشے میں کھڑے تھے پھر انہوں نے تھانا انچارج کو دیکھا جو ابھی ابھی تبدیل ہو کر آیا تھا اور وائرلیس پر ایس پی سے کہہ رہا تھا کہ پولیس ہیڈ کوارٹر سے کچھ کمک بھیج دی جائے، حالات بے قابو ہو سکتے ہیں۔ پھر انہوں نے محمود صاحب کو دیکھا جن کی جیب میں ان کے ۵۰۱ روپے اب بھی پڑے ہوں گے۔ پھر انہوں نے سوچا کہ رام دین اتنی دیر میں نیلے کو دیہات کی گڑھی میں جا کر چھوڑ آیا ہو گا۔ پھر انہوں نے بہ آوازِ بلند محمود صاحب سے کہا۔ "محمود میاں! میرے دونوں لڑکے بھی یہیں ہیں، آپ بھی ذرا اپنے صاحب زادے کو بلا لیجیے تاکہ آپ کو یہ شکایت نہ رہے کہ میرے بیٹوں کو تو میرے ساتھ تھانے میں آنے دیا گیا اور آپ کو محروم رکھا گیا۔"

محمود صاحب اس سخاوت کا مطلب نہیں سمجھے لیکن انہوں نے جلدی جلدی آوازیں دے کر بیٹے کو تھانے لانے کے لیے کچھ لوگوں کو ہدایتیں دیں۔ ان کا بڑا بیٹا بھیڑ ہی میں موجود تھا، وہ آکر ان کے پاس خاموش کھڑا ہو گیا۔

ٹھاکر صاحب نے انچارج کے کان کے پاس جا کر کچھ سرگوشی کی۔ انچارج کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ٹھاکر صاحب نے اس کا منہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ اب ان کے چہرے پر پرانا اعتماد لوٹ آیا تھا، کیوں کہ تھانا انچارج کا منہ اب بھی اتنا کھلا ہوا تھا کہ اندر سے پان میں رنگی داڑھیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

"محمود میاں!" ٹھاکر صاحب نرمی سے بولے۔ "آج آپ کی بیٹی کی شادی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کی تقریب میں کوئی بدمزگی ہو۔"

محمود میاں اور ان کا بیٹا دونوں اس جملے کا مطلب نہیں سمجھے۔ ٹھاکر نے ان کی اس نافہمی کا لطف لیا اور ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولے۔ "آج آپ نے شادی میں بلا کر مجھ سے اپنا سیاسی بدلا لینے کے لیے، مجھے بدنام کرنے کے لیے میرے نیلے کو دھتورا کھلوایا۔ آپ کے بیٹے نے اپنے ہاتھ سے دھتورا کھلایا۔ سیکڑوں آدمی اس بات کے گواہ ہیں۔ کیوں میاں! تم نے نیلے کو کچھ کھلایا تھا کہ نہیں؟"

محمود صاحب کا بیٹا حیران رہ گیا۔ "میں نے تو گُڑ کھلایا تھا۔"

"کون یقین کرے گا کہ آپ میرے جانور سے اتنی محبّت کر سکتے ہیں۔ آپ تو اس وقت میری عزّت کے دشمن ہو رہے ہیں۔"

بازی پلٹتی دیکھ کر محمود میاں کا رنگ فق ہو گیا لیکن انہوں نے پڑھے لکھوں والا ایک پینترا اچلا۔

"نیلے کا میڈیکل چیک اپ کروا کر دیکھیں گے۔"

ٹھاکر صاحب ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک کونے میں لے گئے۔ بھیڑ خاموش کھڑی دیکھتی رہی۔ انچارج وائرلیس پر ملّاجی کی خیریت معلوم کرتا رہا۔

ٹھاکر صاحب نے محمود صاحب سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "نیلا گڑھی پہنچ چکا ہے اور اب تک اسے برائے نام سہی لیکن اتنا دھتورا کھلایا جا چکا ہو گا کہ میڈیکل رپورٹ میں آجائے۔ کوئی اس بات کا یقین نہیں کرے گا کہ اسے دھتورا میں نے کھلایا ہے کیوں کہ قصبے کی آدھی آبادی اور آپ کی پوری برات نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آپ کے صاحب زادے نے اسے گُڑ میں ملا ملا کر خوب دھتورا کھلایا۔ اب جیسا آپ بہتر سمجھیں، میں تو بہرحال آپ کا شبھ چنتک (خیر خواہ)

	رائل فین	عام پنکھے
بجلی کا استعمال	80 واٹ فی گھنٹہ	140 واٹ فی گھنٹہ
24 گھنٹے میں بجلی کا خرچ	1.920 کلوواٹ	3.600 کلوواٹ
ایک ماہ میں بجلی کا خرچ	57 کلوواٹ	108 کلوواٹ
بجلی کا ماہانہ بل	200 روپے کم	200 روپے زیادہ (دگنا)
ایئر ڈلیوری (ہوا کا پھیلاؤ)	11500 کیوبک فٹ	7000 کیوبک فٹ
ایئر ڈلیوری (فی واٹ)	144 کیوبک فٹ	50 کیوبک فٹ
گارنٹی	لائف ٹائم	کوئی گارنٹی نہیں

ہوں۔ میں نہیں چاہوں گا کہ جس بہن کی آج رخصتی ہو رہی ہے، اس کے بھائی کو حوالات میں بٹھا کر سوالات کیے جائیں۔"

محمود میاں کی سمجھ کام نہیں کر رہی تھی۔ آج بہت عمدہ موقع ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ بیٹے کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس کم بخت نیلے کو گڑ کھلائے اور وہ بھی سب کے سامنے۔

ٹھاکر صاحب کرسی کی پشت سے پوری پیٹھ لگائے اطمینان سے تنے بیٹھے تھے۔ اس طرح بیٹھ کر جو بات کہی جائے، اس میں بڑا وزن پیدا ہو جاتا ہے۔

انچارج نے موقع کو بڑی جلدی پڑھا اور محمود صاحب سے کہا۔ "۳۰۲ کی رپورٹ تب تک نہیں لکھی جا سکتی جب تک موت واقع نہ ہو جائے۔ ۳۰۷ کی رپورٹ لکھی جا سکتی ہے لیکن کون لکھوائے گا؟ میں اپنی طرف سے کیس تبھی درج کروں گا جب مجھے یہ علم ہو جائے کہ مارنے والا کون تھا اور اس کی ولدیت کیا تھی۔ ٹھاکر صاحب تو کہتے ہیں کہ اس نیلے سے ان کا اتنا ہی سمبندھ ہے کہ وہ ان کی گڑھی میں، حویلی میں آجاتا ہے تو وہ اسے کھانا دے دیتے ہیں۔ وہ اسے اپنا پالتو ماننے کو تیار نہیں ہیں۔"

"یہ سچ بھی ہے۔" ٹھاکر اُودَل سنگھ مضبوط لہجے میں بولے۔ "نہ تو اس کی گردن میں میرا پٹا ہے نہ اسے پالنے کا کوئی نمبری لائسنس میرے پاس ہے۔"

"تو اسے گولی سے اُڑا دیجیے۔" محمود صاحب کا بیٹا جوش میں چلایا۔

"ضرور اڑا دیجیے لیکن قصبے کی آدھی آبادی آپ کی دشمن ہو جائے گی کیوں کہ یہ گئوہتیا ہوگی۔ میری طرف سے کوئی انکار نہیں لیکن آپ کو اپنا سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔" ٹھاکر صاحب اب ماہر شہ سوار کی طرح ڈلکی چل رہے تھے۔

اب انچارج نے اپنی باری سنبھالی۔

"اہم بات یہ ہے کہ ملّاجی کی اصل چوٹ سر کی چوٹ ہے جو دکان کے چبوترے سے ٹکرانے کی وجہ سے لگی۔ پیٹھ پر تو نیلے کا معمولی دھکّا لگا تھا۔"

"کیا وہ جان بوجھ کر دکان کے چبوترے سے ٹکرائے تھے؟"

محمود صاحب کا لڑکا بولا۔

"نہیں۔" انچارج رسان سے گویا ہوا۔ "لیکن فوج داری عدالت میں اس قسم کی باریکیاں بہت اہم رول ادا کرتی ہیں۔ پھر نیلے پر مقدمہ کیسے چلایا جا سکتا ہے جب کہ ٹھاکر صاحب اسے اپنا پالتو ماننے پر راضی ہی نہیں ہیں۔"

"واہ، گڑھی اور حویلی کی حفاظت کرے تو پالتو اور کہیں غلط حرکت کر جائے تو غیر۔" محمود صاحب کا لڑکا بہت طیش میں تھا۔

ٹھاکر صاحب مسکراتے رہے۔ اس درمیان اپنے بیٹوں اور ان کے ساتھیوں کی مدد سے وہ مجمع میں یہ شوشہ چھوڑ چکے تھے کہ نیلے کو دھتورا کھلا کر وقتی طور پر پاگل کرنے والا کوئی اور نہیں، ان کے قریبی مخالف محمود صاحب کا بیٹا ہے جو اپنے جرم کا اقرار انچارج تھانا کے سامنے کر چکا ہے۔ مجمع کے تیور بھی بدلتے جا رہے تھے۔ جوش و خروش اچانک کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔

"پھر ایک اہم بات اور۔۔۔۔" انچارج نے قانون کی کتاب کا ایک سبق یاد کر کے بتایا۔ "اگر ٹھاکر صاحب، نیلا آپ کے حوالے کر بھی دیں تو آپ اسے مار نہیں سکتے۔ ایک تو عوامی رائے آپ کے خلاف ہو گی کیوں کہ یہ گئو پریوار کا مانا جاتا ہے لیکن میں اس سلسلے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کیوں کہ میں تو سرکاری ملازم ہوں، صرف قانون کی بات سمجھ سکتا ہوں اور سمجھا سکتا ہوں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ اسے یوں بھی نہیں مار سکتے کہ قانون مجریہ ۱۹۷۲ء کے مطابق اسے مارنا جرم قابلِ دست اندازیٔ پولیس ہے اور اس کی سزا۔۔۔۔" وہ چپ ہو گیا اس سے زیادہ بولنا ضروری بھی نہیں تھا کیوں کہ محمود صاحب اب رازداری کے لہجے میں ٹھاکر صاحب کو مشورہ دے رہے تھے کہ اگر ملّاجی بچ جائیں تو کیا خدمت کرنا چاہیے اور خدانخواستہ کام آجائیں تو ان کی بیوہ کو کیا دینا چاہیے۔

انچارج نے پھاٹک پر جا کر پہلے تو سب کو یہ بتایا کہ ایسے موقعوں پر بدلے اور انتقام سے زیادہ اس بات کی پروا کرنی چاہیے کہ مضروب کو جلد از جلد اسپتال لے جایا جائے۔ آپ میں سے کسی نے یہ کام کیا؟ انہیں اسپتال تک لے جانا تو بڑی

بات، اُٹھا کر پانی ہی پلا دیا ہوتا۔ مجمع کو سانپ سُونگھ گیا۔ "دھارمک رنگ دینے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اس کا انجام فساد بھی ہو سکتا ہے جس میں دسیوں بے گناہ مارے جا سکتے ہیں۔" مجمع کو دوسرا سانپ سُونگھ گیا۔

پھر اس نے دیسی گالیوں اور بدیسی کریمنل کوڈ کی مدد سے مجمع کو بتایا کہ مجمع کا ہر آدمی کم از کم دو تین دفعات کی زد پر ہے۔ جب وہ سارے سانپ سُنگھوا چکا تو آکر اپنی کرسی پر یوں اکڑ کر بیٹھ گیا جیسے تھانا انچارج کو بیٹھنا چاہیے۔

جب وائرلیس پر ملّاجی کی موت کی اطلاع ملی تب اس نے پوز میں قدرے فرق لانا مناسب سمجھا۔ اس درمیان مجمع چھٹ چکا تھا۔ وہ رات ٹھاکر صاحب نے حویلی میں نہیں، گڑھی میں گزاری۔

ملّاجی کے خاندان کو ٹھاکر اُودَل سنگھ نے خاطر خواہ تاوان دیا اور محمود صاحب نے مشورہ دیا کہ اس روپے کو خاموشی سے لے کر کام میں لے آؤ ورنہ مسلمانوں کو معلوم ہو گیا تو تمہاری عزّت بھی خاک میں مل جائے گی۔ انہوں نے سمجھایا۔ "اور ویسے بھی اس واردات میں ٹھاکر اُودَل سنگھ کا کیا قصور ہے۔ دراصل نیلا ان کا پالتو جانور تو ہے نہیں۔ اس کا مطلب وہ وحشی ہے، وحشی اس لیے کہ ٹھاکر صاحب نے اس کے گلے میں اپنا پٹا تو ڈالا نہیں ہے، تو اگر وہ وحشی ہے تو وحشت کبھی بھی بھڑک سکتی ہے اور کیوں کہ وحشت کبھی بھی بھڑک سکتی ہے، اس میں جانور کا کیا قصور؟ کیوں کہ ایک اعتبار سے جانور ایک الگ چیز ہے اور اس کی وحشت ایک الگ چیز، اس لیے کہ جانور پر وحشت ہمیشہ طاری نہیں رہتی، کبھی کبھی آتی ہے تو جو چیز کبھی کبھی آتی ہے اس کے لیے جانور بھی مستقل مجرم نہیں گردانا جا سکتا۔ جانور اگر وحشت سے الگ ایک چیز ہے تو اسے جانور پہلے سمجھنا چاہیے اور وحشی بعد میں۔ اگر وہ پہلے ایک جانور ہے اور وحشی بعد میں تو اس صورت میں فیصلہ اس کی جانور والی حیثیت سے کرنا چاہیے نہ کہ وحشت والی حیثیت سے۔ اگر وحشت والی حیثیت سے فیصلہ کرنا ہے تو صرف حالتِ وحشت کے وقت وہ فیصلہ مناسب جانا جائے گا نہ کہ ہر حالت میں اور کیوں کہ وہ اس وقت وحشت والی حالت میں تو ہے نہیں، صرف جانور والی حالت میں ہے، اس صورت میں۔۔۔"

ملّاجی کے خاندان والے راضی ہو گئے۔

محمود صاحب نے خود پر اندر ہی اندر ناز کیا کہ وہ بھی اگر کوشش کریں تو ٹھاکر اُودَل سنگھ کے انداز میں خاصی دیر تک گفتگو کر سکتے ہیں یعنی ایسی گفتگو جس میں جھوٹ کبھی نہیں ہوتا، ہر لفظ سچّا ہوتا ہے، لفظ کے معنی بھی سچّے ہوتے ہیں اور ان لفظوں میں جو لفظ ملا کر بولے جاتے ہیں، وہ بھی سچّے ہوتے ہیں اور ان لفظوں کے اور ان کے علاوہ جو دوسرے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، ان الفاظ کے معنی بھی سچّے ہوتے ہیں۔

❋ ایک عرصے سے شہر کی منڈی کا مزاج بدل رہا تھا۔ اس مزاج کا اثر قصبے اور دیہات پر بھی پڑنا لازمی تھا۔ آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر تبدیلی آرہی تھی لیکن حالیہ دنوں میں کچھ تبدیلیاں اچانک اور واضح طور پر سامنے آنے لگی تھیں۔

ٹھاکر اُودَل سنگھ تبدیلی بہت جلد قبول کرتے تھے۔ دیہات میں سب سے پہلے RR21 اور K-68 گیہوں بیج کے طور پر انہوں نے ہی استعمال کیا تھا۔ یوریا کھاد سب سے پہلے انہوں نے ہی اپنے کھیتوں میں استعمال کی۔ تھریسر اور ٹریکٹر تو ضلع میں سب سے پہلے ان کے ہاں آیا تھا۔ کس چیز پر کتنی

ممتاز حسن، پیدائش،16اگست 1907ء،انتقال29اکتوبر1974ء۔ ماہر آثارِ قدیمہ، اقتصادیات، تعلیم۔ انشا پرداز اور براڈ کاسٹر۔ ایف سی کالج لاہور سے ایم اے۔ 1939ء میں وزیرِ مالیات سر جریمی ریز مین کے پرائیویٹ سکریٹری، غیر منقسم ہندوستان میں وزیرِ مالیات نواب زادہ لیاقت علی خاں کے سکریٹری۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی آپ بیتی "انڈیا ونس فریڈم" میں لکھا ہے کہ لیاقت علی خاں خوش قسمت تھے۔ اُنھیں اپنے اِرد گرد قابل ترین مسلم ماہرینِ مالیات کے ایک گروہ کی رفاقت نصیب تھی۔ لیاقت علی خاں کی جانب سے پیش کیے جانے والے بجٹ کی کام یابی نے دھوم مچادی تھی۔ اُن کے رفقائے کار ماہرین مالیات میں ایک ممتاز حسن بھی تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد اُنھیں پہلا سکریٹری مالیات مقرر کیا گیا۔ کچھ وقت کے لیے وہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے گورنر بھی رہے۔

ممتاز حسن کی پوتی شازیہ حسن کہتی ہیں۔ "وزارتِ مالیات میں دادا شب و روز مصروف تھے، اُن کی عادت تھی کہ رقم جیب میں رکھنا بھول جاتے تھے۔ ایک روز سرِ راہ کسی فقیر سے سامنا ہو گیا۔ فقیر کے سوال پر دادا نے معذرت کی کہ اُن کے پاس اُسے دینے کے لیے فی الحال کچھ بھی نہیں ہے۔ فقیر نے یہ سُن کے جیب سے ایک سکہ نکالا اور دادا کی طرف بڑھا دیا، دادا اُس کی صورت دیکھتے رہ گئے۔"

1968ء میں ممتاز حسن کو پنجاب یونی ورسٹی کی طرف سے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی جا رہی تھی، ساتھ ہی ایف سی کالج میں انگریزی کے ایک پُرانے استاد اور پرنسپل کو بھی ریٹائرمنٹ کے بعد اسی ڈگری سے نوازا جا رہا تھا۔ اس موقع پر دونوں حضرات کی تصویریں کھینچی گئیں۔ ممتاز حسن مطمئن نہیں تھے۔ وہ اب بھی خود کو سنک لیئر کا شاگرد سمجھتے تھے۔ ممتاز حسن کے اصرار پر دوسری تصویر کھینچی گئی۔ اس مرتبہ ممتاز حسن' سنک لیئر کے قدموں میں بیٹھے تھے۔

ایک بار ہندوپاک مشاعرے کے دوران ایک شاعر نے اپنی نظم یا غزل کے بجائے نعت پڑھ دی۔ ممتاز حسن صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے مشاعرے کی کارروائی اُسی وقت روک دی جب شاعر کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ حضرت پیغمبر صلعم کے ذکر کے بعد کسی کے ٹوٹے ہوئے دل یا ہجر و وصال کا ذکر مناسب نہیں۔ لہٰذا یہ عظیم الشان مشاعرہ بیس منٹ میں ختم ہو گیا۔

❀

کسی موقع پر ایک ہندو جوتشی نے ممتاز حسن کا زائچہ (جنم پتری) تیار کیا تھا اور اُن کی زندگی کے اہم واقعات کے بارے میں سچی سچی پیش گوئیاں کی تھیں۔ حسن کو علم نجوم پر یقین نہیں تھا اور انہوں نے زائچے کا کاغذ پرانے کاغذوں میں کہیں پھینک دیا تھا لیکن اپنی موت کے بارے میں نجومی کی پیش گوئی اُن کے ذہن پر نقش ہو گئی تھی۔ اپنی موت سے دو ماہ قبل برسلز میں منعقدہ دوسری عالمی کانفرنس میں جاتے ہوئے انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے امتیاز حسن سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ملک سے باہر میرا انتقال ہو جائے تو تم میری میت پاکستان لاؤ گے اور مجھے اپنی دادی کے پہلو میں دفن کرو گے۔" وہ بہ حفاظت گھر واپس آ گئے۔ موت سے ایک ہفتے قبل انہوں نے بہت سے دوستوں سے ملاقاتیں کیں اور ہر ایک سے اپنی کسی زیادتی، دل آزاری کی معافی چاہی۔
28اکتوبر1974ء کو نجومی کی پیش گوئی کے عین مطابق وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اپنے ایک دوست کے مکان پر وہ کار میں سوار ہونے کو تھے کہ پھسل گئے اور کار کے فرش سے ٹکرائے۔ اُن کی کنپٹی پر گہری چوٹ آئی تھی۔ اسپتال جاتے ہوئے وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

رعایت ملتی ہے، انہیں از بر رہتا تھا۔ کس شہر میں کیا کیا نئی چیزیں استعمال ہو رہی ہیں، انہیں سب سے پہلے معلوم ہو جاتا تھا۔ وہ ترقی کرنے اور پیسہ کمانے کے ہر ہنر سے واقف تھے۔ بس پیسے کا صحیح استعمال ایک ایسا باب تھا جس میں وہ زیادہ دل چسپی نہیں لیتے تھے۔ وہ اقتدار اور پیسے کو ایک دوسرے کا حامی و مددگار سمجھتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ ان میں کوئی بھی چیز ایک دوسرے کے بغیر حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اقتدار کیوں کہ چھو کر محسوس کی جانے والی چیز نہیں (اور اس بات کا انہیں بہت

افسوس تھا) اس لیے وہ اس کے بدل یعنی پیسے کو بہت حفاظت سے جمع کرتے تھے اور اسی لیے نفسیاتی طور پر وہ نیلے کی ضرورت کے محتاج تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی وجہ سے بدنامی بھی بہت ہوئی لیکن وہ ساری بدنامیاں پیسے سے دھوئی جا سکتی تھیں اور دھوئی جاتی رہی تھیں اور پیسے کی حفاظت میں نیلے کا بڑا حصہ تھا۔ کبھی کبھی تو وہ بہت سنجیدگی سے یہ بات سوچتے کہ ان جیسے صاحبِ دولت اور صاحبِ اقتدار کے پاس اس قسم کا ایک ہتھیار ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں کہ کچھ فتنے اسی لیے پالے جاتے

سلامی

پنڈت ہری چند اختر بیس پچیس سال پہلے تک ہر بڑے مشاعرے میں ممتاز حسن مرحوم کی دعوت پر پاکستان آتے تھے اور بڑی شہرت رکھتے تھے، ان کے بارے میں ایک بار عبدالمجید سالک نے اپنے کالم میں لکھا کہ "پنڈت ہری چند اختر کا نام کیا ہے، مسلم لیگ کا جھنڈا ہے۔ ہری یعنی سبز، چند یعنی چاند اور اختر یعنی ستارہ۔" پنڈت جی نے کالم پڑھا تو اخبار کے دفتر پہنچے اور کہا۔ "سالک صاحب! کھڑے ہوجائیے اور مسلم لیگ کے جھنڈے کو جھک کر سلامی دیجیے۔"

ڈاکٹر جمیل جالبی کے ایک مضمون سے

ہیں کہ وہ بُرے وقت میں ساتھ دیں یا اچھا وقت اور بہتر بنائیں۔ مال اور اقتدار کی اس بھاگم بھاگ آنکھ مچولی میں وہ کچھ معمولی چیزیں نظر انداز بھی کر گئے تھے جیسے اپنی خانگی زندگی، ذاتی سکون اور ضمیر وغیرہ۔

جب سے منڈی کے مزاج میں تبدیلیاں آئی تھیں، وہ دن رات اپنی دیہی اراضی کی معیشت اور قصبے کی کاروباری زندگی شہر کی نئی تبدیلیوں سے ہم آہنگ کرنے میں لگے رہتے تھے۔ انہیں اتنا اطمینان ہر حال میں رہتا تھا کہ اگر ان کی آنکھیں بند ہوجائیں تو ان کے وارث موجود ہیں جو ان کا اقتدار اور تموّل دونوں بہت سبک دستی کے ساتھ خود تک منتقل کرلیں گے۔ جہاں تک اپنی زندگی کا معاملہ تھا، وہ مطمئن تھے کہ جب سے نیلا پالا ہے، گڑھی اور حویلی کے علاقے میں ان کی دہشت پھیل گئی ہے اور کوئی ان کی دولت اور اقتدار کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔

ٹھاکر اُودَل سنگھ شہر کی منڈی کی تبدیلیوں سے اپنی معیشت ہم آہنگ کرنے اور قصبے کی سیاست میں خود کو مستحکم کرنے اور دیہات کی اراضی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش میں مستقل لگے رہتے۔ ان کے بیٹے بھی ان کے مددگار تھے حالانکہ یہ اور بات ہے کہ ان کا مزاج اور عادتیں ٹھاکر کے مزاج اور عادتوں سے قدرے مختلف تھیں۔ خود دونوں بیٹوں کا مزاج ایک دوسرے سے بہت مختلف تھا۔ بڑا پرتاپ اپنی بیوی کے ساتھ مگن، دیہات کے لوگوں میں زیادہ مصروف رہتا، اسے اندازہ تھا کہ ان کے خاندان کی ساکھ کی اصلی بنیاد دیہات کی اراضی ہے۔

چھوٹا اونکار دیہات، قصبے اور شہر تینوں میں دل چسپی لیتا تھا اور نتیجتہً کسی بھی جگہ لگ کر کام نہیں کرپاتا تھا۔ باپ کا زیادہ منظورِ نظر وہی تھا۔ زندگی کے دوسرے مظاہر میں بھی اس کی دل چسپی زیادہ تھی۔ حالانکہ پچھلے سال اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی اور بیوی بھی بڑی خوب صورت اور چلبلی ملی تھی لیکن وہ قدرت کی دیگر نعمتوں کا منکر نہیں بننا چاہتا تھا۔

ادھر کچھ دنوں سے گاؤں کے ایک حصّے نے محسوس کیا کہ اسے اس کا پورا حق نہیں ملتا۔ نہر کا بمباسب کی مشترکہ ملکیت تھا لیکن اس کی زیادہ تر نالیاں ٹھاکر کے کھیتوں میں یا اس کی موافقت والوں کے کھیتوں میں کھلتی تھیں۔ پرانی پیڑھی بمبے کی یہ نالیاں بمبے کی تعمیر کا ایک جزو سمجھتی تھی لیکن جب سے لونڈے جوان ہوئے تھے، کہنے لگے تھے کہ بمبے میں نئی نالیاں بھی بنائی جاسکتی ہیں اور یہ کہ کچھ پرانی نالیاں بند بھی کی جاسکتی ہیں کیوں کہ ان کی وجہ سے کبھی کبھی پانی بہت برباد ہوجاتا ہے۔ وہ اکثر اس قسم کی شکایت لے کر ٹھاکر کے پاس آتے تو گڑھی کے دروازے پر کھڑا نیلا سینگ آگے کرکے انہیں روک دیتا۔ وہ اُلٹے قدموں واپس تو چلے جاتے لیکن دل ہی دل میں آگے کے منصوبے بناتے ہوئے واپس جاتے۔

ضلع پریشد سے کوئی اسکیم اگر گاؤں کے لیے پاس ہوتی تو اس کا فائدہ بھی انہی گھرانوں کو ملتا جو ٹھاکر کے زیادہ قریب تھے۔ ٹھاکر نے سیاست کے طور پر اپنے گھر سے دُور گاؤں کی سرحد پر بنے دو ایک گھرانوں کو بھی مراعات کا حصّے دار بنا رکھا تھا تاکہ گرام پنچایت میں کوئی یہ شکایت نہ کرسکے کہ ٹھاکر صرف ان گھرانوں کو فائدہ پہنچاتا ہے جن کی دیواریں اس کی گڑھی سے ملی ہوئی ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ سرحدی گھرانے بھی اس کی حمایت کا دَم بھرتے رہتے اور گاؤں میں ایک طرح کا توازن قائم رہتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ توازن اکثر ٹھاکر ہی کے حق میں جاتا تھا۔ گاؤں کی حد تک ٹھاکر کی کوشش بھی یہی رہتی کہ توازن اس کے اور اس کی حمایت والوں ہی کے حق میں رہے۔ متاثرہ افراد کا سامنا ٹھاکر سے ہو ہی نہیں پاتا تھا کیوں کہ گڑھی کے دروازے پر نیلا انہیں روک دیتا تھا۔ غیر فطری غذا کھا کھا کر نیلے کی جبلّت میں بھی کچھ حیرت انگیز تبدیلیاں ایسی آگئی تھیں کہ وہ کبھی کبھی خود بخود گڑھی سے نکل کر ان متاثرہ افراد کے گوشے میں پہنچ کر ان کے گھروں میں گھس کر توڑ پھوڑ مچاتا اور بچّوں اور عورتوں کو کھوندتا ہوا، اینڈتا ہوا واپس آجاتا۔ ٹھاکر کی شہ پر پجاری کی موافقت اور قانون کے ڈر کی وجہ سے کوئی اسے براہِ راست گزند نہیں پہنچاپاتا تھا۔

قصبے میں، جو ٹھاکر کی سیاست کا مرکز تھا، کم و بیش یہی حالت تھی۔ البتہ شہر کے حکّام کبھی کبھی ٹھاکر کو تنبیہ کردیتے تھے۔ شہر کے حکّام بھی صرف اس حد تک تنبیہ کرتے تھے جس حد تک ضروری سمجھتے تھے تاکہ دوسرے قصبے والے زیادہ اُلارنہ ہوجائیں۔

زندگی بہت خاطر خواہ توازن سے چل رہی تھی۔ گڑھی میں پرتاپ کی بیوی نے بچّوں کی ہنڈیا پکوائی۔ محلّے پڑوس کے لوگوں کو بھی بلایا۔ کمہار کی بیوہ پچھلے موسم میں اپنے پتی کے پاس جاچکی تھی۔ چھٹکی بیاہ کر اپنی بڑی بہن کے منگیتر کے گھر جاچکی تھی۔ بڑکی اب اپنے خاندان میں اکیلی تھی۔ برتن بنانے کا کام اکیلے اس کے بس کا نہیں رہ گیا تھا۔ میڈیکل رپورٹ کے بعد جب اپنا منگیتر ہی انکاری ہوگیا تو اس سے اور کون شادی کرتا۔ وہ راضی بہ رضا زندگی گزار رہی تھی۔ گدھے بیچ کر اس کا پیسہ بڑی بہو کے پاس جمع کرا کے وہ گڑھی ہی میں چھوٹا موٹا کام کرکے وقت گزار لیتی اور کبھی جھونپڑے میں، کبھی بہو کے پائینتی سوجاتی۔ اس کا منگیتر یعنی بہنوئی مقدمے سے بَری ہوگیا تھا کیوں کہ ٹھاکر صاحب نے پولیس کے کیس داخل کرنے سے پہلے ذاتی استغاثہ دائر کردیا تھا اور پھر عدم پیروی میں اپنا کیس خارج کرالیا تھا۔ ٹھاکر صاحب جانتے تھے کہ اس قسم کے فضول مقدمے جیت کر بھی کوئی فائدہ نہیں۔

نئی بہو زیادہ چھوا چھوت نہیں مانتی تھی۔ بڑکی کو خوب اچھی طرح نہا کر آنے کی ہدایت کی تھی اور جب وہ آئی تو اسے پوریاں بیلنے بٹھادیا۔ بڑکی اِس عزّت افزائی پر خوش ہوکر جُھوم جُھوم کر پوریاں بیلنے لگی۔ اونکار بھی سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ پرتاپ کے بچّے وہیں رسوئی میں جمے بیٹھے ہنڈکلیا پکنے کا انتظار کررہے تھے۔ اونکار کو محسوس ہوا کہ بڑکی اس رات کے مقابلے میں اب کچھ تگڑی ہوگئی ہے۔ وہ اونکار کے اس احساس سے بے خبر جُھوم جُھوم کر پوریاں بیلتی رہی۔ ظاہر ہے، جب وہ جُھوم جُھوم کر پوریاں بیلے گی تو پورا بدن جھولے گا۔ بھائی کے بیٹے کو پیار کرنے کے بہانے اونکار نے جھک کر اس کی کُرتی پر نظر جمائی اور اگلی پوری بیلنے کا انتظار کرنے لگا۔ بڑکی کو ہلکا سا احساس ہوا کہ اونکار بابو بہت قریب آگئے ہیں مگر وہ چپ رہی۔ جیسے ہی وہ بیلتے بیلتے آگے جھکی، اونکار نے بچّے کو چومنے کے بہانے اپنا سر آگے کردیا اور اس دفعہ کام یاب رہا۔ اس سے بھی زیادہ اہم ایک اور بات ہوئی جس کا اونکار کو وہم و گمان بھی نہیں ہوا۔ جس کا بدن برتتے وقت اس نے آنکھ پر پٹی باندھ دی تھی، اگر ناک پر بھی باندھی ہوتی تو بڑکی، اونکار کی سانس کی مہک محسوس کرکے آج چوکنّا نہ ہوئی ہوتی۔ اس نے زندگی میں صرف ایک مرد کی سانس کی مہک سُونگھی تھی اس لیے اپنا مجرم پہچاننے

مشورہ

میں ایک ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو کے لیے دلّی گیا۔ ریڈیو اسٹیشن پر مشہور شاعر میراجی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا۔ "یہ سوٹ جو آپ نے پہن رکھا ہے، مانگا ہوا لگتا ہے، پچاس نمبر تو اسی کے کٹ جائیں گے۔" ہم لوگ انٹرویو کے کمرے کے باہر بیٹھے تھے۔ میراجی دن بھر ہمارے ساتھ رہے اور ہر ایک کو کام یابی کے گُر بتاتے رہے۔ اسی موقع پر اُنہوں نے ضیا جالندھری سے کہا تھا۔ "ضیا صاحب! انٹرویو کے دوران آپ عقل استعمال نہ کیجیے گا، بس سیدھے سیدھے جواب دیتے جایئے گا۔"

(الطاف گوہر کی کتاب "تحریریں چند" سے)

میں اسے کوئی دِقّت نہیں ہوئی۔ اب اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنے آپ کو اور آگے جُھکادیا اور اونکار کا چہرہ دیکھے بغیر اسے اندازہ ہوگیا کہ اس وقت اونکار کے دل کی کیا حالت ہوگی، اس طرح اس نے اونکار کی سانسوں کی مہک کی دوبارہ تصدیق کی۔ اس نے اس رات جھونپڑے کی اذیّتیں یاد کیں تو اسے اُبکائی سی آگئی۔ وہ تیزی سے پوریاں بیلتی رہی۔ کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی تو اونکار، بچّے کو لیے رسوئی کے دوسرے کونے میں جا کر بچّوں جیسی باتیں کرنے لگا۔ آنے والی بڑی بھابی تھی۔ بڑکی پوریاں بیلتی رہی اور بڑی بھابی کا چہرہ دیکھتی رہی۔

رات کو اس نے بڑی بھابی کے سر میں خوب طبیعت سے تیل لگایا، اس کی پیٹھ پر مالش کی۔ پھر اس کی ٹانگیں گود میں رکھ کر دیر تک پنڈلیاں دباتی رہی۔ بھابی بدن دبواتے دبواتے تھک گئی تو بولی۔ "اب سوجا بڑکی۔" بڑکی آہستہ آہستہ رونے لگی۔ "کیا ہوا؟" بھابی نے اچنبھے سے پوچھا۔

بڑکی نے اس کے دونوں پیر ہاتھوں میں تھامے اور ان پر اپنا سر رکھ کر بولی۔ "میر دیودن اونکار بابو نے لُوٹوا ے۔"

وہ زمین پر اور بڑی بھابی چارپائی پر لیٹی پچھلے موسموں کی وہ خوف ناک رات یاد کرتی رہی۔ اونکار کے دوست نے جہاں جہاں نیل ڈالے تھے، ان پر ہاتھ پھیر کر بڑی بھابی نے دانت پیستے ہوئے رات کاٹی۔

دوسرے دن بڑکی اپنی بہن سے ملنے اس کے گاؤں چلی گئی اور دو تین دن بعد واپس آکر اپنے کام میں لگ گئی۔ وہ اندر سے آتے جاتے نیلے کو کچھ نہ کچھ کھلادیتی۔ نیلا بھی اسے دیکھ کر اگر بیٹھا ہوتا تو اُٹھ کر اس کے پاس آکر اس کا ہاتھ چاٹنے لگتا۔

ایک رات جب کہرا بہت شدید تھا اور گاؤں کے دھویں

میں مل کر بہت گاڑھا اور ٹھوس ہو گیا تھا اور ہوائیں تیز تھیں اور جاڑا شدید تھا تو گڑھی کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے دو سائے آواز کے بغیر اندر کودے اور سیدھے اونکار کے کوٹھے میں پہنچے۔ اونکار کے پلنگ کے پاس پہنچ کر اُس نے جو زیادہ تگڑا تھا، اونکار کے منہ پر ہاتھ رکھ کر گردن دبائی اور گٹھری کی طرح باندھ لیا۔ دوسرے نے اونکار کی سوتی ہوئی بیوی کو، جو چونکی تک نہیں تھی، اس انداز سے بے قابو کیا کہ اس کا ایک ہاتھ تو تکیے کے ذریعے اس کا منہ دبائے ہوئے تھا، دوسرا ہاتھ چاقو تھامے ہوئے تھا جس کی چمک اونکار کی بیوی کو اندھیرے کے باوجود نظر آ رہی تھی۔ وہ گھگھیانے سی لگی مگر آواز تکیے کی دبازت میں گھٹ کر رہ گئی۔ پھر اس نے اطمینان سے اسے اچھی طرح باندھا اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ تگڑا آدمی بڑی گٹھری لے کر گڑھی کے دروازے سے نکل گیا۔ دوسرا آدمی چھوٹی گٹھری لے کر سامنے کمہار کے جھونپڑے میں گیا اور اونکار کی بیوی کو پیال پر ڈال کر، آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے چہرے کا مڑا سا کھول کر پورا سبق یاد کیا جو اس کی سابقہ منگیتر اور حالیہ سالی نے اس کے گھر آ کر اسے پورا ماجرا بتا کر یاد کرایا تھا۔

بڑکی اس درمیان نیلے کو کھوئے کے پھیکے پیڑے کھلاتی رہی اور سرسوں کا خالص تیل پلاتی رہی اور ہچلوں سے اندازہ کرتی رہی کہ اب کیا ہو رہا ہو گا۔

اگلی صبح بہت سی تازہ خبروں کے ساتھ طلوع ہوئی۔ پہلی خبر تو یہ تھی کہ اونکار گھر سے غائب تھا اور اس کے کپڑے نہر کے کنارے پائے گئے تھے۔

دوسری خبر یہ تھی کہ اونکار کی بیوی کو کوئی زبردستی اُٹھا کر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ جان بچا کر بھاگ آئی۔ یہ خبر تو بالکل سچ تھی کیوں کہ کسی نے اسے اُٹھا کر لے جانے کی کوشش تو کی تھی، یہ اور بات ہے کہ وہ کامیاب بھی ہوا تھا۔ خبر کا دوسرا حصّہ بھی سچ تھا کہ وہ اپنی جان بچا کر بھاگ آئی کہ بہرحال اس کی جان تو بچ ہی گئی تھی۔

تیسری خبر یہ تھی کہ جب ٹھاکر نے اپنے پہرے کے نوکروں پر جوتے پڑوائے تو اس دفعہ انہوں نے کوئی اعتراف نہیں کیا بلکہ صرف یہ واقعہ بیان کیا کہ بڑکی کے ہاتھ سے رات کو کھانا اور گڑ لے کر وہ لوگ لیٹ گئے تھے اور معمول سے زیادہ دیر تک جاگتے رہے تھے کیوں کہ گڑ میں بہت کڑواہٹ تھی جیسی پرانے گڑ میں پیدا ہو جاتی ہے اور پھر بے خبر سو گئے تھے جیسے روز سوتے ہیں کیوں کہ اب نیلے کی موجودی میں انہیں چوکی داری کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں تھی۔

چوتھی خبر یہ تھی کہ چھٹکی کا پتی گڑھی کے پیچھے مردہ پایا گیا۔ اس کے سینے پر چاقوؤں کے کئی گھاؤ تھے۔ بعد میں میڈیکل رپورٹ نے بتایا کہ موت چاقو کے زخموں اور زیادہ خون نکل جانے کی وجہ سے ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ معدے میں دھتورے کے بیج بھی پائے گئے۔

پانچویں خبر یہ تھی کہ بڑکی اپنے جھونپڑے میں مردہ پائی گئی۔ بعد میں میڈیکل رپورٹ سے پتہ چلا کہ اس کے معدے میں بھی دھتورے کے بیج پائے گئے۔ اس کے بدن پر چوٹ کا کوئی نشان نہیں تھا۔

ایک معمولی خبر یہ بھی تھی کہ بھیکو کا لونڈا اچانک پاگل ہو گیا ہے اور بار بار ڈوبتے ہوئے آدمی کی نقلیں کرتا ہے اور ہنستا ہے۔

ایک ضمنی خبر یہ بھی تھی کہ بڑی بہو نے پرتاپ سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ یا تو وہ اسے میکے بھیج دے یا پھر اس کے ساتھ آ کر گڑھی میں رہے۔ اس ضمنی خبر میں ایک ضمنی ٹکڑا یہ بھی تھا کہ بڑی بہو کو اب نیلے سے بہت ڈر لگنے لگا ہے۔

علاقے کی پولیس نے اس متعدّی قتل کیس میں بہت جی جان سے محنت کر کے تفتیش کی اور ہفتے کے اندر اندر ایک ایک واقعے کی چُول سے چُول بٹھا دی۔

کمہار کی چھوٹی لڑکی چھٹکی کے خلاف چارج شیٹ داخل ہوئی جس کا لبِّ لباب یہ تھا کہ چھٹکی، بھیکو کے بیٹے کی آشنا تھی۔ ان دونوں کو نامناسب حالت میں دیکھ کر چھٹکی کے شوہر پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے انتقاماً گڑھی میں جا کر کسی بہانے سے بڑکی کو بلایا اور کسی نہ کسی طرح راضی کر کے پہرے داروں کو اور پھر بڑکی کو دھتورا کھلا کر خود بھی دھتورا کھا کر بری نیّت سے بڑکی کو اس کے جھونپڑے میں لے گیا لیکن اس درمیان اونکار کی آنکھ کُھل گئی۔ اس نے باہر آ کر جھونپڑے کے پاس جا کر چھٹکی کے شوہر کو للکارا۔ چھٹکی کے شوہر نے اونکار پر قابو پا لیا اور راز کُھلنے کے ڈر سے اس کی گٹھری بنا کر نہر میں ڈبو دیا۔ نہر کی پٹڑی پر بھیکو کے بیٹے نے یہ ڈوبنے والا منظر دیکھا اور ہوش و حواس کھو بیٹھا اور دوسرے گاؤں جا کر چھٹکی کو بلا لایا۔ چھٹکی نے جب یہ سنا کہ اس کا شوہر بڑکی کی عزّت لوٹنا چاہتا تھا تو وہ غصّے میں گاؤں آئی اور اس نے اپنے دھتورے کے نشے میں مدہوش شوہر کو اونکار کی بیوی کو اُٹھا کر لاتے اور پھر اسے جان بچا کر بھاگتے دیکھا تو یہ سوچ کر طیش میں آ گئی اور سوچا کہ تھوڑی دیر پہلے اس نے میری بہن کی عزّت لوٹنا چاہی اور اب ایک معصوم انسان کا قتل کر کے اس کی بیوی کی عزّت لوٹنا چاہتا ہے، یہ سوچ کر تیہے میں آ کر اس نے دھتورے کے نشے میں

مدہوش شوہر کو چاقو سے مار مار کر ختم کر دیا اور بھاگ کر اپنے گاؤں پہنچ گئی۔ بھیکو کا بیٹا یہ دو قتل دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ شہادت کے طور پر چھٹکی کے گاؤں کے کچھ لوگوں کا نام دیا گیا تھا جو اس بات کے چشم دید گواہ تھے کہ پچھلے دو روز سے بھیکو کا بیٹا، چھٹکی اور اس کے شوہر سے ملنے آ رہا تھا۔

چھٹکی نے زنانہ حوالات کی سلاخوں سے سر نکال کر سوچا کہ وہ تو کہیں آئی نہ گئی، اس نے اپنے پتی کا خون کیوں اور کیسے کر دیا۔ میں نے تو بھیکو کو بڑکی کے ساتھ تین دن پہلے اپنے گاؤں آتے دیکھا تھا تو پوچھنے پر بڑکی نے بتایا کہ بھیکو اپنی پتنی کو چھوڑ کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اسی لیے چھٹکی کے پتی کے پاس روز مشورہ کرنے آتے ہیں۔ میں چوکے میں بیٹھی ان تینوں کے لیے کچوریاں بناتی رہتی اور یہ تینوں باہری کوٹھے میں سر جوڑے بیٹھے بیاہ کی بات کرتے رہتے۔ جاتے وقت بڑکی میرے پتی کو بلا گئی تھی کہ وہ آکر اس کے گاؤں میں بھیکو کے بھائیوں سے بیاہ کی بات کر لے۔ وہ اپنا دیہاتی دماغ لڑاتی رہی۔

بھیکو کے گھر جانے کے بجائے میرا پتی بڑکی کے جھونپڑے پر پہنچا ہو گا۔ وہاں اسے اکیلا دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی ہو گی۔ پہلے تو سگائی اسی سے ہوئی تھی نا۔ بڑکی بھی اب تک میرے پتی کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتی تھی۔ میرا پتی بھی اکثر لڑائی میں اُلاہنا دیتا تھا کہ اس سے اچھا تھا کہ میرا بڑکی سے بیاہ ہوا ہوتا۔

بھیکو کے گھر بیاہ کی بات کرنے جب دونوں نہیں پہنچے ہوں گے تو بھیکو کا بیٹا ان کی تلاش میں جھونپڑے پر آیا ہو گا۔ جھونپڑے میں دونوں کو ایک ساتھ لیٹا دیکھ کر وہ اونکار بابو کو بلا لایا ہو گا۔ بڑکی کا گرم گرم بچھونا چھوڑنے کے غصّے میں میرے پتی نے اونکار کو مار کر نہر میں ڈبو دیا ہو گا۔ بھیکو کا بیٹا یہ دیکھ کر پورا پاگل ہو گیا ہو گا۔ واپسی میں میرا پتی پھر بڑکی کے جھونپڑے پر گیا ہو گا۔ اتنے میں گڑھی سے اونکار کی بیوی نے آکر میرے پتی کو چاقو سے گود دیا ہو گا۔ بڑکی یہ سب دیکھ کر دھتورا کھا کر مر گئی۔ اگر وہ بڑکی کے ساتھ سونے کا ایسا ہی شوقین تھا تو اس کا جو انجام ہوا وہ اچھا ہی ہوا۔ یہ سوچ کر اسے کچھ اطمینان سا ہوا پھر اچانک اسے اپنا اور بڑکی کا بچپن اور لڑکپن اور شروع جوانی کا وقت ساتھ یاد آیا۔ پھر اپنے مرے ہوئے پتی کا گٹھا ہوا مضبوط شریر یاد آیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کا پتی شہر سے اس کے لیے ہمیشہ پیڑے لاتا تھا اور پیڑے کھا کر گرم گرم دودھ پی کر وہ دونوں چھت پر سونے چلے جاتے تھے۔ اچانک اسے اپنے شوہر کے قاتل اونکار کی بیوی سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔

سلاخوں کے باہر آہٹ ہوئی۔ پولیس کی زنانی نے آکر اس سے پانی کے لیے پوچھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے بہتا گدلا گدلا پانی پونچھا اور ہاتھ کے اشارے سے پانی کو منع کیا۔

باہر سُسر جی نے پہرے کے نوکروں کو ابھی ابھی پٹوایا ہے۔ جٹھانی صبح سے روتے روتے ابھی چپ ہو کر جیٹھ جی کے ساتھ اپنے کمرے میں گئی ہیں۔ نیلا سُسر جی کے پاس کھڑا دُم کو چکّر دے رہا ہے۔

وہ کون تھا جو مجھے باندھ کر جھونپڑے میں لے گیا تھا اور پھر میری آنکھوں پر پٹّی باندھ کر کس بُری طرح میرے بدن کی دُرگت بنائی تھی۔ پھر رک رک کر، سوچ سوچ کر کیسے اس نے میرے شریر کی بے عزّتی کی تھی۔ پھر کیسے میرا جسم بناڈھکے وہ جھونپڑے سے نکل کر بھاگا تھا۔ میں کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد رسّی کھول کر آنکھوں کی پٹّی ہٹا کر خود کو گڑھی کے اندر لے گئی تھی، جہاں دروازے پر نیلا چپ چاپ کھڑا مجھے اپنے کمرے میں جاتے دیکھتا رہا تھا۔ کسی کو خبر نہیں ہو پائی کہ اس رات میری عزّت لٹی تھی۔

وہ کون تھا!! چھٹکی کا پتی یا بھیکو کا لڑکا؟ وہ بھیکو کا لڑکا ہی ہو گا۔ کیوں کہ اس کی پتنی کو نیلے نے زخمی کیا تھا اور سُسر جی نے آخر تک غلطی نہیں مانی تھی۔ اس نے اس طرح اپنا انتقام لیا۔ پھر آخر اونکار کو چھٹکی کے پتی نے کیوں نہر میں ڈبویا؟ اس نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ پھر بڑکی دھتورا کھا کر کیوں مر گئی؟ وہ تو جٹھانی کے کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔ وہاں سے کب نکل کر آگئی تھی، جٹھانی کو خبر بھی نہیں ہو سکی۔ کیا بڑکی نے جٹھانی کو بھی سونے سے پہلے تھوڑا سا دھتورا کھلا دیا تھا؟ چھٹکی کا میاں اور بڑکی اس واقعے میں کہاں سے آگئے اور یہ دونوں مر کیوں گئے؟ ان دونوں کو کس نے مارا؟

اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ یقیناً ایسا ہوا ہو گا کہ چھٹکی نے رات کو آکر گڑھی کے پیچھے اپنے پتی اور بڑکی کو بری حالت میں دیکھا ہو گا، دھتورے کے نشے میں چور اپنے پتی کو چاقو سے مارنے میں اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی ہو گی۔ البتہ بڑکی کو بڑی بہن سمجھ کر معاف کر دیا ہو گا مگر بڑکی شرمندگی سے بچنے کے لیے دھتورا کھا کر جھونپڑے میں آکر سو گئی ہو گی مگر اونکار کو چھٹکی کے پتی نے نہر میں کیوں ڈبویا؟

باہر کچھ شور سنائی دیا۔ اس نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔ گڑھی کے دروازے کے باہر بھیکو کا بیٹا زمین پر پڑا ڈوبتے ہوئے آدمی کی نقل کر کے گھٹی گھٹی آواز میں چلّا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی

زور سے بند کی اور پلنگ پر اوندھی لیٹ کر سسکنے لگی۔

بڑی بہو نے لیٹے لیٹے کروٹ بدلی۔ اب رات ہو گئی تھی۔ پرتاپ چت لیٹا چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ اس نے ظاہر کیا، جیسے وہ سو رہی ہے۔ ویسے بھی پچھلے کئی دنوں سے سونے اور جاگنے میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کھڑکی کے باہر آنگن میں سُسر جی ابھی تک ٹہل رہے تھے۔ بڑی بہو کی سمجھ میں جہاں کچھ اور باتیں نہیں آئی تھیں، وہیں یہ بات بھی دُھند لکے میں تھی کہ کیا واقعی چھوٹی بہو بیچ راستے سے عزّت بچا کر بھاگ آئی تھی؟ کیا اس کے شریر پر نیل نہیں پڑے، کیا اس کا پنڈا کورا ہی ہے؟ اس احساس ہی سے اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ جب جب وہ یہ سوچتی، اسے سانس سینے میں گھٹتا محسوس ہونے لگتا۔ ہو سکتا ہے، وہ اپنی لاج بچانے کے لیے جھوٹ بول رہی ہو۔ یقیناً یہی بات ہے ورنہ ایسے ٹانگیں پھینک پھینک کر کیوں چل رہی تھی۔ اس نے پھر کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ کھڑکی کے بالکل نزدیک ایک سایہ کھڑا تھا۔ وہ چیخنے ہی والی تھی کہ اسے نیلے کی سانسیں سنائی دیں۔ نیلا کھڑکی کے پاس تھوتھنی کیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اُٹھیے اُٹھیے۔“ وہ تیز سرگوشیوں میں پرتاپ سے مخاطب ہوئی۔

”کیا بات ہے، کیا ہوا؟“ پرتاپ پلنگ پر بیٹھ گیا۔

”کچھ نہیں۔ مجھے نیلے سے ڈر لگتا ہے، کھڑکی کے پاس کھڑا ہے۔“ وہ بیٹھی تھر تھر کانپتی رہی۔

● ٹھاکر اُودَل سنگھ نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر اپنی سانسیں درست کیں۔ آنگن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ کر انہوں نے یاد کیا کہ اونکار بچپن ہی سے کتنا ضدّی تھا۔ میلے میں جاتا تو ہر اچھی چیز کے لیے پسر جاتا۔ مٹّی کی ڈھیر ساری گڑیاں، شیر، بھالو، غبارے، رنگین کاغذ کی پتنگیں اور جانے کیا کیا الابلا گود میں اُٹھائے لے آتا اور تھوڑی دیر میں ہر چیز توڑ پھوڑ کر برابر کر دیتا۔ چیز حاصل ہونے کے بعد اس کے لیے بے قیمت اور بے وقعت ہو جاتی تھی۔ آج وہ سیکڑوں من پانی کے نیچے دبا ہوا ہو گا۔ مچھلیوں نے بدن پر گوشت کا ریشہ بھی نہ چھوڑا ہو گا۔ کرنی کا پھل تو ملتا ہی ہے مگر اسی جنم میں اسے کیوں مل گیا، اس کا انہیں افسوس تھا۔ انہوں نے آسمان کی طرف دُکھی نظروں سے دیکھا کیوں کہ اس جنم میں تو وہ اس کے باپ تھے۔ انہوں نے سر اُٹھا کر پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک طرف سے ماہوٹ کی بدلیاں بڑھی چلی آ رہی تھیں اور تارے ان بدلیوں میں آہستہ آہستہ کھوتے جا رہے تھے۔ بادلوں کی وجہ سے سردی

کچھ کم لگ رہی تھی۔ پہرے کے نوکر گڑھی کے دروازے پر ان کی طرف پیٹھ کیے بیڑی پی رہے تھے۔ نیلا بڑے بیٹے کے کمرے کی کھڑکی کے پاس، کھڑکی میں جھانک رہا تھا۔ چھوٹی بہو اپنے مائکے والوں کے ساتھ اپنے کمرے میں لیٹ چکی تھی اور اس کے کمرے کی روشنی دھیمی ہو چکی تھی۔

اونکار ان کے سامنے کھڑا تھا اور ان سے پیسے مانگ رہا تھا۔ وہ اونکار کو پیسے دے رہے تھے۔ اونکار نے ان سے شہر جا کر سنیما دیکھنے کی آگیا چاہی، انہوں نے اجازت دے دی۔ اونکار چلا گیا اور پھر آگیا۔ اتنی مدت میں وہ کچھ بڑا ہو گیا تھا۔ انہوں نے اونکار سے کہا کہ چیئرمینی کا الیکشن جیتنا آسان کام نہیں ہوتا۔ کچھ تگڑے پٹھے بھی ساتھ میں ہونے چاہئیں۔ کبھی کبھی ووٹوں والا بکسا بھی اُٹھانا پڑتا ہے۔ اونکار موٹر سائکل پر گیا اور ٹریکٹر کی ٹرالی میں تگڑے تگڑے پٹھے بٹھا کر لے آیا۔ یہ نریش ہے، یہ سلطانہ ہے، یہ رمیش ہے۔ (اس کے چہرے پر گھاؤ کے دو نشان تھے) یہ بلّا ہے، یہ بہاری ہے۔ پھر وہ الیکشن جیت گئے تھے۔

”اونکار۔۔۔ بیٹا! اسکول کے پاس والے پلاٹ پر اگر کل امبیڈکر جینتی کا سماروہ ہو گیا تو یہ پلاٹ ہمیشہ کے لیے ہمارے ہاتھ سے چلا جائے گا۔ ہم کسی کو وہاں سماروہ منانے سے روک بھی نہیں سکتے۔ بس آج کی رات ہمارے پاس ہے۔“ یہ بات انہوں نے قصبے کی حویلی میں بیٹھ کر کہی تھی۔

اونکار نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ موٹر سائکل پر بیٹھ کر دیہات جا کر ٹریکٹر لایا، اپنے ساتھ چار پٹھے لیے۔ راج مستریوں کے محلّے میں جا کر بندو معمار کے چاروں نوجوان لونڈوں کو بٹھایا۔ ٹریکٹر پر گاؤں سے بیس کسان پکڑ کر بٹھا لایا۔ بھٹّے کے مالک لالہ ویریندر کو جگا کر ان کے بھٹّے پر لے گیا، ٹریکٹر کی ٹرالی میں بھٹّے کی اینٹوں کے چار چکّر لگوائے۔ اتنی دیر میں نیو کھودی جا چکی تھی۔ مٹّی کا گارا بن چکا تھا۔

پو پھٹتے پھٹتے دیواریں اتنی اونچی اُٹھ گئیں کہ گاؤں کے کسان ایک دوسرے کو گھوڑا بنا کر ان پر چڑھ کر دیوار پر بیٹھے ہوئے معماروں کو گارے کی پرات اور اینٹیں پکڑا رہے تھے۔ حویلی سے رات ہی رات کچھ پرانے کواڑ قبضوں سمیت نکلوا کر نئے پلاٹ کی بے چھت کی عمارت میں نصب کرائے۔ جب اڈّے کی مسجد کا بڈھا ملا اذان دے رہا تھا، اس وقت نئی عمارت کے اندر فرش چورس کر کے اینٹیں بچھائی جا چکی تھیں۔

صبح ہوئی تو امبیڈکر جینتی والوں نے منہ پھاڑ پھاڑ کر سر پر ہاتھ رکھ کر یہ تعمیر دیکھی۔ اونکار نے بھور بھئے مجھے جگا کر کسانوں کی شراب اور معماروں کے جوڑے کے پیسے لیے تھے۔

"تونے بڑکی کو کیوں بگاڑا مورکھ! اپنا ہی گاؤں محلہ ملا تھا تجھے؟" یہ کہہ کر ٹھاکر نے ایک کرارا طمانچہ اونکار کے منہ پر مارا اور دیکھا کہ ان کی موٹی موٹی انگلیاں اس کے سرخ گالوں پر ابھر آئی ہیں۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔ "دُور ہو جا میرے سامنے سے۔" وہ چلا گیا تھا۔ وہ دروازے سے نکلتے وقت کھسیایا ہوا تھا مگر اس کے منہ سے دھیمی دھیمی ہنسی کی آواز نکل رہی تھی۔ اس کے اس طرح شرمندہ ہونے اور بڑے جرم کی چھوٹی سزا ملنے کی خوشی اور ہنسی پر انہیں روٹھا روٹھا پیار آیا تھا۔

انہوں نے آسمان کی طرف پھر دیکھا اور واپس آتے ہوئے سوچا کہ اونکار اب کہاں ہے۔ وہ تو ان بادلوں کے پرے جا چکا ہے یا ہو سکتا ہے، ابھی تک اس کی آتما نہر کے کنارے جھاڑیوں میں بھٹک رہی ہو۔ انہیں اپنے سینے میں ایک بھاری دھسک محسوس ہوئی۔ انہوں نے اس بے چینی کے عالم میں آنکھیں بند کر کے سوچا کہ یہ سیاست، دولت، اقتدار پر تاپ کے بس کی بات نہیں، وہ تو میری زندگی ہی میں ان چیزوں کی حفاظت مشکل سے کر پائے گا۔ اس سوچ نے ان کی بے چینی اور گہری کر دی۔

برابر میں کچھ آہٹ سی ہوئی۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، سامنے اونکار کھڑا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کا تھا۔ اس کی لمبی سی تھوتھنی تھی اور موٹے موٹے آدھے چندرما کے آکار کے سینگ تھے۔ وہ اُٹھے اور نیلے کی گردن سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

ان کے رونے کی آوازیں سن کر پہرے کے نوکر بھاگے ہوئے ان کے پاس آئے جنھیں گالیاں دے کر پھر ان کی جگہ بھیج دیا گیا۔ ٹھاکر اُودَل سنگھ کی عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ اونکار کا قتل کس نے کیا؟ اس کا قتل چھٹکی کے پتی نے کیا تو چھٹکی کے پتی کو کس نے مارا؟ پھر بڑکی کو دھتورا کھلا کر کس نے ختم کیا؟ بڑکی کو تو معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کی عزّت کس نے لوٹی تھی۔ بھیکو کے لونڈے کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟ انہوں نے تھانا انچارج سے بھی گھنٹوں ان معاملات پر گفتگو کی تھی۔ تھانا انچارج یہی کہتا تھا کہ اونکار کا قتل انہی مقتولین میں سے کسی نے کیا ہو گا لیکن اب ملزم کی پکڑ نہ ہونے کی وجہ سے چھٹکی ہی کو چارج شیٹ کرنا مناسب ہے، کیوں کہ کیس چاروں طرف سے چوکس بیٹھ رہا ہے۔ وہ دیر تک تانے بانے سلجھاتے رہے مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا۔

نیلا زمین پر بیٹھا بیٹھا اونگھنے لگا تھا۔

✤ دھرتی پر ہل چلتا ہے تو اس کے سینے پر ایک گہری مانگ پڑ جاتی ہے لیکن ہل کے دوسرے ہی پھیرے میں اس مانگ میں مٹی بھر جاتی ہے۔ زندگی کے زخم وقت بھی اسی طرح بھرتا رہتا ہے۔ شب و روز کا ہل چلتا رہتا ہے اور دکھوں کی گہری لکیریں معاملات کی مٹّی سے بھرتی رہتی ہیں۔ یہ انتظام نہ ہو تو زندگی کے کھیت میں فصلیں اگنا ہی بند ہو جائیں۔ چیئرمینی کے اگلے الیکشن کی تیاری میں ٹھاکر اُودَل سنگھ کا دکھ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ عدالت نے عینی شاہد نہ ہونے کی وجہ سے چھٹکی کو رہا کر دیا۔ اب وہ چھوٹ کر اپنے پرانے جھونپڑے میں لیپ پوت کر رہنے لگی تھی۔ بھیکو کا بیٹا تین سال پاگل خانے میں رہ کر آ گیا تھا۔ اس نے کھیتی کا کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کھیتوں کے پار میدانوں میں نہر کے پاس چھدری چھدری بیلوں کے سائے میں بیٹھا ایک ٹک آسمان دیکھتا رہتا تھا۔ اس کی بیوی نے اس کی بہت خدمت کی مگر اب وہ مایوس ہو گئی تھی۔ وہ جب بھی بھیکو کے بیٹے سے کوئی سوال کرتی، بھیکو کے بیٹے پر دورہ پڑ جاتا اور وہ ڈوبتے ہوئے آدمی کی نقلیں کرتے کرتے بے حال ہو جاتا۔ بیوی وقت بے وقت کھیتوں کی طرف نکل جاتی اور اندھیرا ہونے کے بعد واپس آتی تب بھی اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

ٹھاکر اُودَل سنگھ ایک بار پھر الیکشن جیت گئے۔ جیت والی رات حویلی میں جشن منایا گیا۔ اُودَل سنگھ نے مٹھی بھر بادام نیلے کے منہ میں ڈالے جسے وہ مزے لے لے کر چباتا رہا۔ اچانک انہیں اونکار یاد آیا۔ انہوں نے ایک مٹھی بادام نیلے کے منہ میں اور ڈالے۔

دو مٹھی باداموں کا اثر تیسرے دن ظاہر ہوا۔ رات کو وہ حویلی کے پھاٹک سے نکلا، سیدھا اس جگہ پہنچا جہاں اس نے کچھ سال پہلے گائے اور بیل کے راز و نیاز کا سہانا منظر دیکھا تھا۔ طویلے میں خاک اڑ رہی تھی۔ وہ کھڑا اپنے پاؤں پٹختا رہا۔ برابر میں کانجی ہاؤس تھا۔ کانجی ہاؤس کے بوسیدہ ٹین کے دروازے کی جِھری سے اس نے دیکھا کہ اندر کچھ مریل سے دوچار گائے،

جھروکے

سترھویں صدی میں ایک بار سلطان ابراہیم کے حرم میں یہ اطلاع پہنچی کہ اُس کی کسی کنیز کا خواجہ سَرا سے خفیہ تعلق ہے۔ سلطان کے حکم پر اس اطلاع کی تصدیق کے لیے سخت تفتیش کی گئی لیکن موردِ الزام کنیز کا سراغ نہ ملا۔ محل میں ۲۸۰ کنیزیں تھیں۔ سلطان نے طیش میں اُن سب کو بوریوں میں بھر کے باسفورس میں ڈبونے کا حکم دے دیا۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔

☆

مسلمان حکمرانوں میں سب سے بڑا حرم عثمانی خلفا کا تھا۔ ایک عثمانی سلطان یلدرم کو تیمور کے ہاتھوں شکست ہوئی تو تیمور نے یلدرم کو ایک پنجرے میں بند کر دیا اور اس کی ملکہ کو برہنہ کر کے دربار میں ساقی گری پر مامور کیا۔ اس واقعے کا عثمانی خلفا پر بہت اثر پڑا۔ انہوں نے شادی کرنا ہی چھوڑ دیا اور ان کے حرم میں صرف کنیزیں رکھی جانے لگیں۔

☆

دوسری جنگِ عظیم میں جاپانیوں نے اپنے فوجیوں کے لیے کوریا کی عورتیں زبردستی فوجی کیمپوں میں رکھیں۔ ویت نام کی جنگ کے دوران بنکاک کو امریکی فوجیوں کے لیے عصمت فروشی کا مرکز بنا دیا گیا۔

التمش دور کے ایک عالمِ دین نورالدین مبارک کا کہنا تھا کہ طوائفیں ختم نہیں کرنی چاہئیں ورنہ لوگ نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے شریف گھرانوں میں گھسیں گے۔ اکبرِ اعظم نے شہر کی ساری طوائفیں ایک علاقے میں آباد کر کے علاقے کا نام شیطان پورہ رکھ دیا تھا۔

ظہیر اختر بیدری

بیل اور بجار کھڑے ہیں۔ سینگوں کی ایک ہی ٹکر سے اس نے ٹین کا دروازہ توڑ دیا۔ سارے مویشی کانجی ہاؤس سے نکل کر جہاں سینگ سمایا، بھاگ لیے۔ تھوڑی دور پر بھینسوں کا طویلا تھا، وہاں پہنچ کر اس نے بھینسوں کو اپنے سینگوں سے ریلنا شروع کر دیا، بھینسیں رسیاں تڑا تڑا کر بھاگیں اور قصبے کی سرحد کے پاس کھیتوں میں گھس گئیں۔ نیلا ادھر سے فارغ ہوا تو پینٹھ جانے والے راستے پر جو مکان ملے، ان کے اندر گھس کر سوتے ہوئے آدمیوں کو چارپائیوں ہی پر کھوند ڈالا۔ پکار مچی تو محلے کے لوگ دوڑے ہوئے آئے۔ کچھ لوگ زخمیوں کی مرہم پٹی کرانے اسپتال لے گئے۔ باقی لاٹھیاں لے کر اس کی تلاش میں نکل پڑے جس نے یہ سب کیا تھا۔ نیلے نے آدمیوں کی پکار سنی تو اندھیرے ہی میں اس نے راستہ کاٹا اور بیریوں میں ہوتا ہوا کھیتوں میں اترا اور کھیتوں کھیتوں ہوتا ہوا کہیں گم ہو گیا۔

ٹھاکر صاحب کی حویلی پر بہت ہجوم تھا۔ ٹھاکر صاحب نے محسوس کیا کہ اس ہجوم میں سارے لوگ ان کے مخالف نہیں ہیں۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ قصبے کے اکثر لوگ ٹھاکر صاحب کو پسند کرتے تھے کیوں کہ ٹھاکر صاحب جا بے جا اکثر ان کا ساتھ بھی دیتے تھے لیکن نیلے کے سالہا سال کے ہنگاموں اور بربادیوں سے تنگ آ کر وہ ہم نوا لوگ بھی ٹھاکر صاحب سے تو نہیں لیکن نیلے سے ضرور نفرت کرنے لگے تھے۔ ٹھاکر صاحب نے مجمع کو یقین دلایا کہ وہ آج ہی اس کا انتظام کریں گے اور اس سلسلے میں میونسپل بورڈ کے آفس میں ایک ہنگامی میٹنگ طلب کی گئی۔

آفس کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سارے ممبران حاضر تھے۔ محمود صاحب پرانی چوٹیں بھولے نہیں تھے۔ آج پھر ایک موقع تھا۔ اس دفعہ انہوں نے اچھی تیاری کی تھی۔ رات ہی رات خفیہ طور پر وہ ضلع کلکٹر سے بھی بات کر آئے تھے۔ میٹنگ بہت شور شرابے میں شروع ہوئی۔ مخالف ممبران اُدھم مچانے میں پیش پیش تھے۔

محمود صاحب نے سارے ممبران کے چہروں کا جائزہ لیا اور اندازہ کیا کہ ٹھاکر صاحب کے موافق ممبر بھی آج کم سے کم نیلے کے معاملے میں تقریباً ہم نوا ہیں۔ اس احساس نے ان کے اندر ایک نئی طاقت بھر دی۔ "بھائیو! میں پہلے بھی ٹھاکر صاحب کو کئی بار اس وحشی جانور کے سلسلے میں آگاہ کر چکا ہوں بلکہ میں نے تو اسی وقت منع کیا تھا جب انہوں نے اسے پالنا شروع کیا تھا۔ مگر یہ میری بات نہیں مانے۔ انہوں نے اسے بادام کھلا کھلا کر پاگل سانڈ بنا دیا ہے۔ شہری انسانوں کا اس طرح کے جانور پالنے کا شوق غیر فطری ہے۔ اس نیلے نے فصلیں برباد کی ہیں، غریبوں کے گھروں کے برتن اور چولھے توڑے ہیں، ننھے ننھے بچوں کو کچلا ہے، بوڑھے آدمی کا خون کیا ہے، طویلے کی بھینسوں کو مار مار کر بھگایا ہے، کانجی ہاؤس کے مویشیوں کو آزاد کیا ہے۔ ماؤں بہنوں کی۔۔۔ (انہوں نے الیکشن کی تقریر پر دل ہی دل میں لعنت بھیجی اور ایک مناسب جملہ ڈھونڈا) ماؤں بہنوں کی راتوں کی نیند حرام کر دی ہے۔ کون ہے جو آج اس قصبے میں چین کی نیند سو سکتا ہے۔ بولیے کون ہے؟"

"کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔" ممبران نے جوش و خروش سے جواب دیا۔

"نہیں، ایک شخص ہے جو آرام سے سوتا ہے اور چین سے آرام کرتا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے اس جملے کا تاثر جاننے کے لیے سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔ سب کی آنکھیں سوال تھیں۔ "وہ شخص ہے ٹھاکر اُودل سنگھ جو ہمارے چیئرمین ہیں۔"

"ٹھاکر اُودل سنگھ، مُردہ باد۔" ممبر چلائے۔

"انہیں اس بات کی پروا نہیں کہ اس نیلے نے کتنے نقصانات کیے۔ مالی اور جسمانی اور جانی۔" محمود صاحب خاطر خواہ اثر دیکھ کر آگے بڑھے۔

ٹھاکر اُودل سنگھ دل ہی دل میں تاؤ کھاتے رہے۔ آخر میں انہوں نے کڑے دل سے ایک فیصلہ کیا اور پوچھا۔ "میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

محمود صاحب نے جواب دیا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ قصبے کو اس آفت سے نجات دلائی جائے۔"

"مگر کیسے؟" ٹھاکر صاحب انہیں اپنی راہ پر لانا چاہتے تھے۔

"جان سے ختم کر کے اور کیسے۔" محمود صاحب گرجے۔

ٹھاکر صاحب یہی سننا چاہتے تھے۔ "ٹھیک ہے۔" ٹھاکر صاحب نے نرمی لیکن مضبوطی سے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ یہ گئوبنسی ہوگی۔"

محمود صاحب نے اندازہ کیا کہ کچھ ممبر یہ بات سن کر ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔

"دوسری بات یہ کہ قانون مجریہ ۱۹۷۲ء کے تحت اسے مارا نہیں جاسکتا۔ اس کی سخت سزا ہے۔" ٹھاکر صاحب نے تھانا انچارج کی گفتگو یاد کر کے یہ جملہ بولا۔

جب انہوں نے اندازہ کر لیا کہ اب ممبر راہِ راست پر آگئے ہیں تو انہوں نے کہا۔ "کیا آپ لوگ قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ پچھلی رات کو جو کچھ ہوا، وہ سب نیلے ہی نے کیا ہے اور کانجی ہاؤس کے بیلوں، طویلے کی بھینسوں نے کچھ نہیں کیا؟ نیلا بدنام ہو گیا تو کیا سارے الزامات اسی کے سر جائیں گے؟ بد بھلا، بدنام برا۔" انہوں نے محاورے کا سہارا لیا۔

"لیکن وہ بیل اور بھینسیں بھی تو نیلے کی وجہ سے مشتعل ہوئیں۔" محمود صاحب نے دور کی کوڑی لی۔

"تو کیا مشتعل کرنے والا ہی سارا مجرم ہے، اشتعال میں آنے والا بالکل معصوم ہے۔" ٹھاکر صاحب گرجے۔ پھر انہوں نے ایک وکیل ممبر سے کہا۔ "وکیل صاحب! آپ بتائیے۔ مشتعل ہونے والے اور مشتعل کرنے والے کی سزائیں کیا مختلف ہیں؟"

ممبر وکیل صاحب کیوں کہ ٹھاکر صاحب کی پارٹی کے آدمی تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ وکیل بھی تھے اور پیشے کی لاج رکھنا بھی ضروری تھا اس لیے ان کا جواب بہت مدلل اور ٹھوس تھا۔ "دراصل اشتعال میں آنا ایک ایسا فعل ہے جس کی جڑیں انسانی لاشعور میں دور تک پیوست ہوتی ہیں۔ اگر لاشعور کا وہ حصہ ذرّہ برابر بھی مجرمانہ مادہ رکھتا ہے تو اشتعال میں آنے کے لیے ایک ہلکی سی تحریک بھی کافی ہوتی ہے لیکن مشتعل کرنے والے کو بھی بے قصور نہیں کہہ سکتے اور سچ پوچھیے تو قصوروار بھی اس وقت تک نہیں کہہ سکتے جب تک اس امر کی تحقیق نہ ہو جائے کہ مشتعل کرنے والے نے مشتعل ہونے والے کے ساتھ وہ کون سا فعل کیا جس کی وجہ سے مشتعل ہونے والا مشتعل ہوا۔ معاملۂ ہٰذا میں نیلے نے صرف اتنا کیا کہ کانجی ہاؤس کے دروازے سے اپنی پیٹھ رگڑی کیوں کہ جانوروں کو پیٹھ رگڑنے کی عادت ہوتی ہے، اس دھمک سے پرانا دروازہ ٹوٹ گیا اور دوسرے جانور جو موقع کا انتظار کرتے رہتے ہیں، آزاد ہو گئے اور پھر انہوں نے من مانی کی۔ کیوں کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ نیلے نے انہیں ترغیب دے کر فصلیں برباد کرائیں

درجہ بہ درجہ

مدراس کے تاڑی نکالنے والا شنار (اچھوت کی ایک قسم) اگر کسی برہمن سے 24 قدم کے فاصلے تک آجائے تو وہ اس برہمن کو ناپاک کر دیتا ہے۔ ایک نایار (دوسری قسم کا اچھوت) کسی نمبودری برہمن کے قریب جاسکتا ہے لیکن اسے چھونا نہیں چاہیے۔ تایان ذات والا (تیسری قسم کا اچھوت) خود کو برہمن سے 208 قدم دور رکھے اور پلایان ذات والا (چوتھی قسم کا اچھوت) برہمن سے 96 قدموں کے فاصلے تک اندر نہ آئے۔ تایان ذات والے کو نایار سے 12 قدم دور رہنا چاہیے۔ بعض ذات والے تایان سے مل سکتے ہیں لیکن اسے چھو نہیں سکتے۔

مرہٹوں کے صوبے میں اچھوتوں کی ایک ذات مہار ہے۔ اسے راہ چلتے سڑک پر تھوکنے کی ممانعت ہے۔ مبادا ایک پاک ذات ہندو کا پاؤں اس تھوک کے لگنے سے پلید ہو جائے اس لیے ایسا اچھوت ایک مٹی کا لوٹا اپنے گلے میں آویزاں رکھے، اس میں تھوک لیا کرے۔ اس کے علاوہ ایک کانٹے دار شاخ اپنے پیچھے گھسیٹتا ہے تاکہ اس کے پاؤں کے نشان مٹ جائیں۔ برہمن سے کچھ فاصلے پر خود کو زمین پر گرالے تاکہ اس کا ناپاک سایہ برہمن کو پلید نہ کر دے۔

بہ شکریہ 'ساحل' کراچی

لہٰذا یہ امر تحقیق و تفتیش طلب ہے کہ نیلے کا پچھلی رات کی بربادی میں ذاتی طور سے کتنا حصّہ ہے اور حصّہ ہے بھی یا نہیں۔"

یہ مدلّل تقریر ابھی ممبران ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ ٹھاکر صاحب نے ایک حسبِ منشا فیصلہ سنایا۔ "بھائیو! نیلے کو تلاش کرنے کی مہم ابھی سے شروع کی جاتی ہے۔ میں تھانے میں بھی بات کروں گا۔ کچھ رضاکارانہ ٹکڑیاں بھی بننا ضروری ہیں کہ ہر کام میونسپل بورڈ نہیں کر سکتا۔ نیلے کو گرفت میں لے کر اس بات کا اندازہ کیا جائے گا کہ آگے کیا کارروائی ہو۔ آج کی میٹنگ برخاست۔"

محمود صاحب نے آج کی میٹنگ کا فیصلہ اپنی کامیابی سمجھا۔ انہوں نے اپنے ممبروں اور موافقین کے ذریعے قصبے بھر میں یہ شہرت کرا دی کہ نیلا پاگل ہو گیا ہے اور اسے انسانی خون کی چاٹ لگ گئی ہے۔

جس نے بھی سنا، دہشت زدہ رہ گیا۔ دہشت کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نیلا چُھپا ہوا تھا اور چھپی ہوئی چیز عیاں چیز کے مقابلے میں زیادہ خطرناک محسوس ہوتی ہے۔ لوگوں نے دیواروں پر نیلے کو پکڑ لانے پر انعام دینے کے اشتہار لگا دیے۔ نیلے کو پکڑنے کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگیں۔

ضلع کلکٹر نے، جو صبح ہی اپنا نمائندہ بھیج کر ٹھاکر صاحب کو تنبیہ کر چکا تھا، شام کو ٹھاکر صاحب کو ضلع آفس میں بلایا۔ ٹھاکر صاحب بادلِ ناخواستہ پہنچے حالانکہ اندر ہی اندر خوش بھی تھے کہ آج کلکٹر سے بات کرنے کا موقع ملے گا۔ شہر میں کلکٹر کے آفس میں داخل ہوئے تو وہ بڑی سی میز کے پیچھے سنجیدگی کے ساتھ بیٹھا نظر آیا۔ بیٹھے بیٹھے اس نے ٹھاکر صاحب سے پوچھا۔ "اُودَل سنگھ جی! نیلے نے بہت تباہیاں مچا رکھی ہیں، روزانہ کوئی نہ کوئی شکایت آ جاتی ہے۔ اب اس کا انتظام کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ آپ نے کیا سوچا ہے؟ میرے اوپر رائے عامّہ کا بہت زبردست دباؤ ہے۔ دوسرے قصبے والے بھی شکایت کر رہے ہیں کہ ٹھاکر کے نیلے کی وجہ سے گاؤں اور قصبے میں بہت بربادی ہو رہی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ کبھی کبھی دوسرے قصبوں اور خود شہر میں بھی آ جاتا ہے۔" ٹھاکر اُودَل سنگھ خاموش رہے۔ "سنا ہے، آپ کہتے ہیں کہ اسے مار دیا جائے تو لوگ گئوہتّیا سمجھ کر جذباتی ہو جائیں گے۔ مجھے آپ سے ایسی طفلانہ باتوں کی امّید نہیں تھی۔ ہم سب کو پڑھے لکھوں جیسی بات کرنا چاہیے۔"

ٹھاکر صاحب بولے۔ "پڑھے لکھوں کے سامنے پڑھے لکھوں جیسی باتیں ہوتی ہیں۔ دیہات اور قصبے میں لوگ اَن پڑھ ہیں۔ انہیں آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔"

"پھر بھی۔" کلکٹر بولا۔ "پھر بھی میں اسے صحیح نہیں مانتا کہ بربادی پھیلانے والے ایک وحشی جانور کو جسے آپ نے پال رکھا ہے، صرف اس وجہ سے نہیں مروایا جا سکتا کہ اَن پڑھ اسے گئوہتّیا سمجھیں گے یا دھرم کا اپمان سمجھیں گے۔"

ٹھاکر صاحب نے ایک اور پینترا چلا۔ "اصل میں بات یہ ہے صاحب کہ آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں، نیلے کو مارنا قانون مجریہ ۱۹۷۲ء کے تحت جُرم ہے۔"

"مگر اس کا علاج ہے۔" کلکٹر بولا۔ "میں فاریسٹ آفیسر سے بات کر کے چیف وائلڈ لائف آفیسر سے اسے پاگل ڈکلیر کرا کے مروا سکتا ہوں۔"

"مگر یہ تو زیادتی ہو گی، نیلا پاگل تو نہیں ہے۔"

"لیکن حرکتیں تو پاگلوں والی کر رہا ہے۔"

"میں اس کا علاج کر رہا ہوں صاحب! آج ہی سے نیلے کو پکڑوانے کی تیاریاں کر لی ہیں۔ آپ مجھے ایک موقع دیجیے۔"

کلکٹر نے بادلِ ناخواستہ انہیں موقع دے دیا۔

سورج غروب ہونے کے بعد لوگوں نے گھروں کے دروازے بند کر رکھے تھے اور گلیوں میں پولیس والے ٹہل رہے تھے، رضاکار ٹکڑیاں کھیتوں اور جنگلوں میں نیلے کی تلاش میں نکل گئی تھیں۔

ٹکڑی نمبر ایک نے بھادوں کی سیاہ رات میں قصبے کے باہر والے بیر کے باغ اور کھیتوں کی پگڈنڈی پر کسی کو کھڑا دیکھا، اشارے سے بتایا، سب لوگ خاموش ہو گئے۔ لاٹھیاں مضبوطی سے پکڑے پکڑے اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے اور بیس گز دور سے اس پر ٹارچ پھینکی۔ تین سیل کی ٹارچ کی روشنی میں دیکھا گیا کہ نیلا دھندلکے میں کھڑا ہے۔ ٹارچ فوراً بند کر لی گئی۔ اس ٹکڑی میں پانچ لوگ تھے۔ قریشیوں کا لونڈا یعقوب جو ایک ہی سانس میں کبڈّی ٹیم کے کسی تگڑے پٹھے کو چُھو کر سامنے والی لکیر پر ہاتھ مار کر آ جاتا تھا۔ وہ آج ہاتھ میں موٹی سی لاٹھی سنبھالے ہوئے تھا، اس کا پڑوسی منشی قصائی کا بڑا بیٹا ہاتھ میں اسٹک لیے ہوئے تھا، وہ قصبے کے انٹر کالج کی ہاکی ٹیم کا کپتان تھا۔ اسی محلّے کے شیخ جلی سمیع انوار کے ہاتھ میں تین سیل کی جیبی ٹارچ تھی۔ وہ خود کو ٹکڑی نمبر ایک کا لیڈر تصوّر کیے ہوئے تھا۔ ان کے پیچھے شکر والوں کا لونڈا گلشن والی بال کا کھلاڑی تھا جو والی بال کھیلتے ہوئے اتنا اونچا اُچھل کر بال مارتا تھا کہ کبھی کبھی جال کے دوسری طرف مخالف ٹیم کے پھالے

میں جا گرتا تھا۔ پانچویں تھے بوڑھے نھّو چچا جو اپنی جوانی میں خرگوش اور تیتر میدان میں دوڑا کر، تھکا کر زمین پر بٹھا لیتے تھے اور ان کے چاروں طرف چکّر لگا کر لحظہ بہ لحظہ قریب ہوتے ہوتے اچانک ڈھیلے یا ڈنڈے سے خرگوش یا تیتر کو زخمی کر کے پکڑ لیتے تھے۔ یہ ٹیم ہر لحاظ سے نیلے کو قابو میں کرنے کے لیے آئیڈیل تھی۔

نھّو چچا نے اشارے سے سب کو کچھ دیر خاموش رہنے کو کہا تاکہ نیلا ان کی طرف سے بے گمان ہو جائے اور آہستہ آہستہ گھیر اڈال کر اُسے لاٹھی اور اسٹک کی مدد سے قابو میں کر لیں۔ بوڑھے نھّو چچا کے ان خاموش مشوروں سے سمیع انوار کو اپنی تین سیل کی ٹارچ اور لیڈری کی بے عزّتی محسوس ہوئی۔ اس نے نھّو چچا کو پیچھے دھکیل کر باقی لوگوں کو اشارے سے پلان سمجھایا کہ اب نیلے کو موقع مت دو، چاروں طرف سے گھیر کر ایک دَم حملہ بول منصوبے پر عمل کرو۔ نیلے کو چاروں طرف سے خاموشی سے گھیر کر ایک ساتھ حملہ ہوا۔ لاٹھی اور اسٹک اچٹ کر مارنے والوں کے ہاتھوں سے ٹکرا کر فضا میں لہرانے لگیں۔ وہ بیری کا ایک موٹا درخت تھا۔

ٹکڑی نمبر ۲ نے آموں کے باغوں میں نیلے کو ڈھونڈنے کا پلان بنایا تھا۔ آموں کے گھنے باغ میں جیسے ہی سب لوگ داخل ہوئے، باغ کے اندر چھپ چھپ کرتا ہوا کوئی بھاگا۔ بارش سے باغ میں کیچڑ ہو گئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں سب نے واضح طور پر دیکھا کہ وہ نیلا ہی تھا۔ مگر وہ ایک بُھورا پٹھا تھا جس کے ابھی سینگ بھی پوری طرح نہیں نکلے تھے۔

ٹکڑی نمبر ۳ نے قصبے کی مشرقی سرحد کے کھنڈروں میں تلاشی کا بیڑا اُٹھایا۔ کھنڈر میں داخل ہوتے ہی سب نے محسوس کیا کہ کھنڈر میں کوئی ذی روح ہے۔ سب کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ وہ ہمّت کر کے آگے بڑھے، ملبے پر چڑھ کر کھنڈر کے آخری سرے تک دیکھا تو وہاں ایک سایہ نظر آیا۔ اگر ٹارچ کی روشنی وہیں سے ڈال دیتے تو وہ بھاگ سکتا تھا، لوگ خاموشی سے ملبے کے نیچے اُتر آئے اور پورا چکّر کاٹ کر دھیمے دھیمے اس ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے پہنچ گئے جس کی آڑ میں نیلا کھڑا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ ٹوٹی ہوئی دیوار سے ہاتھ نکال کر ٹارچ جلائی، وہ رام دین تیلی کی دیوی کے نام پر چھوڑی ہوئی بوڑھی گائے تھی۔

البتّہ ٹکڑی نمبر ۴ نے جب بڑے پوکھر کے کنارے کی جھاڑیوں میں کھڑے نیلے کو چاروں طرف سے گھیر کر لاٹھیوں سے اچھی طرح پیٹ کر زمین پر لٹا دیا اور روشنی میں اس کی چوٹوں کا جائزہ لینے کے لیے لالٹین جلائی تو معلوم ہوا، وہ لڈّن تانگے والے کا لنگڑا گھوڑا تھا جو اَب اپنے لنگڑے پن کی معذوری سے چھٹکارا پانے کی منزل کے بہت پاس پہنچ چکا تھا۔

قصبے کے اندر پولیس والوں نے نیلے کے دھوکے میں جن پالتو جانوروں کو مارا، اس میں ان کا یعنی پولیس والوں کا کوئی قصور نہیں تھا کیوں کہ ان پالتو جانوروں اور نیلے میں بہت چیزیں مشترک تھیں، مثلاً بقاتی کی بھینس اس لیے ماری گئی کہ اس کا قد نیلے کے قد سے ملتا جلتا تھا۔ جمّن ٹال والے کا بیل اس لیے زد پر آیا کہ اس کی اونچائی نیلے کی اونچائی کے برابر تھی۔ گنگا تیلی کا بھینسا اس لیے نشانہ بنا کہ اس میں اور نیلے میں یہ قدرِ مشترک تھی کہ دونوں کے دو دو کان تھے۔

ٹھاکر اُودَل سنگھ اتنی سرگرمی سے نیلے کی تلاش کی مہم دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ وہ حویلی میں آئے، جیپ میں بیٹھ کر سیدھے دیہات پہنچے اور گڑھی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ انہیں نیلا بہت یاد آ رہا تھا۔ گڑھی میں پہنچ کر انہیں خاص طور سے نیلے کی ساری باتیں یاد آ جاتی تھیں۔ آنگن میں پڑی چارپائی پر لیٹ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ انہوں نے سوتے جاگتے کی کیفیت میں دیکھا کہ نیلا ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ہے اور ان کا ہاتھ چاٹ رہا ہے۔ آہٹ پہ آنکھیں کھول دیں، وہ خواب نہیں تھا۔ نیلا واقعی ان کا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ انہوں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے سینگ اور کھر پر تازہ لہو کے نشان تھے۔ انہوں نے گھبرا کر معائنہ کیا کہ خون دوسروں کا ہے یا نیلے کے بدن سے نکلا ہے۔ ٹارچ سے دیکھ کر انہوں نے اوپر والے کا شکر ادا کیا، خون دوسروں ہی کا تھا۔

نیلا اس وقت گڑھی میں تھا۔ حالانکہ درحقیقت وہ اس وقت قصبے میں تھا۔ وہ آموں اور امرودوں اور بیروں اور جامنوں کے ہر باغ میں تھا۔ قصبے کا ہر فرد سمجھ رہا تھا کہ نیلا کہیں اور نہیں، خود اس کے دروازے سے لگا کھڑا ہے۔ بس ذرا دروازہ کھلا اور۔۔۔۔۔

نمبردار اُودَل سنگھ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کرتے تھے البتّہ فیصلہ سنانے میں عجلت سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فیصلہ کرنا اور فیصلہ سنانا دو مختلف عمل ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے میں اُلجھانا مناسب بات نہیں ہے۔ وہ جانتے تھے کہ فیصلہ جلد کرنا عقل مندوں کا شیوہ ہے لیکن فیصلہ ظاہر کرنے میں جلدی کرنا احمقوں کا کام ہے۔ انہوں نے نیلے کے

انجام سے متعلق آخری فیصلہ تو نہیں کیا لیکن اتنا ضرور سوچ لیا کہ فی الوقت کیا کرنا چاہیے۔ نیلے کے بارے میں آخری فیصلہ کرنے کے لیے انہوں نے اپنے آپ سے وقت مانگا جو انہوں نے اپنے آپ کو فوراً دے دیا۔ وہ لوگوں کا ردِ عمل جاننا چاہتے تھے کہ گڑھی کے باہر گاؤں والے، پنچ، اسکول کا ہیڈ ماسٹر اور مندر کا پجاری نیلے کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے؟ انہیں اس بات کی بھی فکر تھی کہ قصبے میں حویلی والے اور حویلی کے باہر دیگر افراد نیلے سے کس حد تک بد ظن ہیں اور کس حد تک خائف؟ میونسپل بورڈ کے مواقف اور مخالف ممبروں کے جوش کا اب کیا حال ہے؟ ضلع کلکٹر شہر میں بیٹھا کن خطوط پر سوچ رہا ہے؟ اس کی فکر کی آنچ بھی ان کے ذہن کے کسی اُجاڑ گوشے میں دھیمے دھیمے سلگ رہی تھی۔

نیلے کے انجام کے بارے میں وہ آخری فیصلہ لے سکتے تھے لیکن انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ فیصلہ نہیں لیں گے۔ پہلے اس معاملے کے ہر پہلو کا باریکی اور گہرائی سے جائزہ لیں گے لیکن باریکی اور گہرائی سے جائزہ لینے کے لیے وقت کی ضرورت تھی۔ نیلے کو کسی غیر نے دیکھ لیا تو وقت ملنا مشکل ہو جائے گا تبھی انہوں نے ایک فیصلہ کیا۔ بڑے کی کھڑکی کے پاس جا کر آواز دی۔ "پرتاپ! او پرتاپ! باہر آؤ بیٹا۔" ان کی آواز سن کر اندر کمرے میں اچانک چوڑیاں کھنکیں۔ وہ کھڑکی سے دُور ہٹ آئے۔ تھوڑی دیر بعد پرتاپ باہر آگیا۔

"نیلا اپنی گڑھی میں آگیا ہے۔" انہوں نے کسی جذبے کے بغیر یہ جملہ ادا کیا۔ دوسروں کا ردِ عمل جاننے کی ابتدا وہ گھر ہی سے کرنا چاہتے تھے۔

پرتاپ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ بنیادی طور پر اچھا آدمی تھا۔ "باپو! اب اس کا گزارا یہاں نہیں ہوگا۔ گاؤں والے، قصبے والے یہاں تک کہ شہر کا کلکٹر بھی، سب کے سب اس کے دشمن ہو گئے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی غلط بھی نہیں ہے۔ اس نے بہت تباہی مچا رکھی ہے۔" پرتاپ نے گڑھی کے آنگن میں اندھیرے میں کھڑے ہوئے نیلے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ بات کہی۔

"لیکن یہ ہمارے کتنے کام آیا ہے اور ابھی بھی کتنے کام آسکتا ہے۔"

نمبردار نے اس کی طویل گفتگو کا مختصر سا جواب اس انداز سے دیا کہ ان کا جواب ایک سوال بن کر پرتاپ کی آنکھوں کے سامنے آنکڑا سا بن کر ناچنے لگا۔ وہ سوچ سوچ کر، رُک رُک کر بولا۔ "باپو! یہ گڑھی اور حویلی کی حفاظت کرتا ہے تاکہ ہمارا دھن دولت اور راج بنا رہے لیکن اتنی بربادی کر دیتا ہے کہ ہمیں اس دھن دولت اور راج کو بھوگنے کا وقت بھی نہیں مل پاتا۔ ہر سمے یہی ذکر سنتے ہیں کہ آج نیلے نے اس کا کھیت اُجاڑ دیا، کل نیلے نے اس کا کھلیان بگاڑ دیا۔ ابھی وہ ننھے بچّوں کو کچل کر آیا ہے، اب وہ بڈھے بے قصوروں کو مارنے جا رہا ہے۔ کبھی اپنے ہی جیسے مویشیوں کو لہولہان کر رہا ہے، کبھی چھوٹی چھوٹی بکریوں پر کھڑا اَڑا رہا ہے۔ ہمیں اپنی چیزوں کی حفاظت کے لیے اس جنگلی کی مدد نہیں لینا چاہیے۔ ہم خود چوکنّا سویا کریں گے۔"

"تم مورکھ ہو پرتاپ! اس کا مطلب، تم اس وچار کے آدمی ہو کہ گڑھی میں یا حویلی میں پہلے چور کو آنے کی چھوٹ دے دو، جب وہ آجائے تو چونک کر اسے پکڑ لو۔ ارے مورکھ! کوشش یہ ہونا چاہیے اور یہی کوشش میں نے کی تھی کہ ایسا نقشہ بن جائے کہ کوئی گڑھی اور حویلی میں گھسنے کا خیال بھی من میں نہ لائے۔" پرتاپ چپ ہو گیا۔ وہ زیادہ دیر تک اپنے باپ سے بحث نہیں کر پاتا تھا۔ "میں نے سوچا ہے۔" انہوں نے پرتاپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا، وہ جانتے تھے کہ پرتاپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ کوئی بات کہتے ہیں تو پرتاپ اُن کی ہم نوائی کرنے لگتا ہے۔ "نیلے کو کچھ دن کے لیے مندر والے ارہر کے گھنے کھیت میں چُھپا دیتے ہیں۔ پھر اندازہ کرتے ہیں کہ لوگوں کا اس کے بارے میں کیا وچار بن رہا ہے۔"

انہوں نے صرف پرتاپ اور گڑھی کے دونوں پہرے دار نوکروں کو اپنا ہم راز بنایا۔

کہرا سا ہو گیا تھا۔ دونوں پہرے دار نیلے کو گڑ اور بادام کھلاتے ہوئے آہستہ آہستہ رات کے سناٹے میں گڑھی سے باہر لے گئے۔ اس کے زخموں پر ہلدی تھوپ دی گئی تھی جس سے بدن کیسریا ہو گیا تھا۔ تنگ گلیوں سے نکال کر آموں کے باغوں کے برابر سے ہوتے ہوئے مندر والے ارہر کے گھنے کھیت کے پاس پہنچے۔ ایک اسے لیے کھڑا رہا، دوسرا اندر جا کر کھیت کے بیچوں بیچ پودے کاٹ کر جگہ بنانے لگا۔ پھر دھیرے دھیرے نیلے کو کھیت میں داخل کر کے اس جگہ پہنچے۔ نیلا اس کھیت سے مانوس تھا۔ اکثر یہاں آیا کرتا تھا۔ اس نے فی الوقت کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اندر ایک موٹا سا کھونٹا ہاتھ بھر زمین میں گاڑ کر نیلے کی گردن میں رسان کے ساتھ رسّی باندھ دی۔ رسّی لمبی تھی۔ اتنی لمبی کہ نیلا آسانی سے چل پھر سکتا تھا۔ دوسرے پھیرے میں بہت سا چارا بہت سا موٹا اناج اور بہت سا گڑ اور بادام لا کر اس کے پاس رکھ دیے گئے۔ ناند میں اوپر تک پانی بھر کر ناند وہیں مٹی میں جما دی گئی۔

واپسی میں سایوں کی طرح رینگتے ہوئے دونوں پہرے دار گڑھی میں پہنچے اور نمبردار کو نیلے کے اس کچّے انتظام کی پکّی خبر دی۔ نمبردار اُودَل سنگھ نے جو اتنی دیر سے سانس روکے بیٹھے تھے، ایک بڑی سی طمانیت بھری سانس باہر چھوڑی۔ "اب تم باہر جا کر اطمینان سے سو جاؤ۔ بہو سے کچھ نہ کہنا۔" انہوں نے ایسے یقین سے کہا گویا شوہر لوگ بیویوں سے راز چُھپا پاتے ہوں۔ ویسے بھی بڑی بہو نے کھڑکی کی اوٹ سے منظر کا آدھا حصہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

نمبردار صبح اُٹھے تو سب سے پہلے گاؤں کا ایک چکّر لگایا۔ لوگ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی کہ آج بہت دنوں بعد نمبردار کو گاؤں پر ٹوٹ کر پیار آیا ہے اور وہ بھی ہر گلی پر۔ عورتوں نے انہیں دیکھ کر گھونگٹ کاڑھ لیے اور مردوں نے ان کے پاس اکٹھے ہو کر نیلے کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ "کیا ہوا نمبردار جی، نیلا ملا کہ نہیں؟"

"بھئی کوشش تو جاری ہے۔ ایک ذرا سے جانور کو ڈھونڈنے کے لیے قصبے میں بیسیوں پولیس والے اور قصبے والے رات دن ایک کیے ہوئے ہیں۔" انہوں نے گول گول بات کی۔

لیکن ان کی اس گول گول بات میں بھی کچھ لوگوں نے اچھے خاصے چوکور مطلب نکال لیے۔ دراصل ذرا سے جانور اور بیسیوں پولیس والے اور قصبے والے لوگوں کی کوشش والا جملہ، نمبردار اُودَل سنگھ کا سوچا سمجھا جملہ، اس بات کا متقاضی تھا کہ لوگ کم از کم ان کے سامنے ہمدردی کا اظہار کریں۔

"کئی دن سے دیکھا نہیں تو عجیب عجیب سا لگتا ہے۔" ان کے ایک پڑوسی نے سنبھل سنبھل کر جملہ بولا۔ لیکن اس جملے سے راستہ کھل گیا۔ ان کے تمام ہم نوا بھیڑ میں اپنی جگہ کھڑے کھڑے ان کی طرف ہو گئے تھے۔ "جانے غریب کو اس بیچ چارا بھی ملا کہ نہیں۔" دوسرے نے تاسّف بھرے لہجے میں خدشے کا اظہار کیا۔

"پچھلے کئی مہینوں سے وہ بالکل چپ چاپ ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے رک جاتا تھا۔" تیسرے نے انکشاف کیا۔

اس انکشاف پر نمبردار کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مگر موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اپنا منہ جلدی سے بند کر لیا اور سوچا، ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔ دراصل یہ بات سچ بھی تھی۔ نیلا چلتے چلتے رک جاتا تھا اور رک کر اس شخص پر حملہ کرتا تھا جو سب سے نزدیک ہو۔ چوتھے نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ابھی پندرہ دن پہلے میں کھیت سے ہل چلا کر واپس آ رہا تھا تو دیکھا، نمبردار کا نیلا مندر کے سامنے کھڑا ہے۔ جیسے ہی سورج دیوتا ڈوبے، نمبردار کے نیلے نے مندر کی طرف منہ کر کے ڈنڈوت کی اور دونوں کھر جوڑ دیے۔" باقی لوگوں کے چہرے پر عقیدت کی روشنی جگ مگ جگ مگ کرنے لگی۔

ٹھاکر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اندازہ کیا کہ جن جن کے گھروں کے برتن نیلے نے توڑے تھے، جن جن کے بچّوں کو کچلا تھا اور جن جن پر حملہ کیا تھا، وہ ان لوگوں کی ہم نوائی نہیں کر رہے، خاموشی سے، ایک بے بس خاموش نگاہی سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں۔ ان کے ہم نوا ان کے ساتھ چلے۔ باقی لوگ پیچھے رہ گئے تھے، انہوں نے واضح سنا، وہ نمبردار اور نیلے دونوں کو سرگوشیوں میں گالیاں دے رہے تھے۔

راستے میں مندر کے پاس رک کر انہوں نے ہاتھ جوڑے۔ پجاری جی باہر نکل آئے۔ انہوں نے اپنے ساتھ کے لوگوں کو سنانے کے لیے پجاری جی سے پوچھا۔ "قصبے میں اٹکھیلیاں کر کے نیلا بھاگا تھا، آپ نے ادھر تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں بیٹا!" پھر کچھ رک کر پجاری جی نے جملہ آگے بڑھایا۔ "ہو سکتا ہے، پاپیوں کی بستی سے کچھ دنوں کے لیے کچھ دور چلا گیا ہو۔"

نمبردار نے سوچا، ساتھ والے دیہاتی خود کو پاپی نہ سمجھیں، انہوں نے اپنے جملے میں اس کی وضاحت کر دی۔ "ہاں مہاراج! قصبے والے ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں، دراصل وہ مجھ سے دشمنی نکالنا چاہتے ہیں۔" وہ یہ کہہ کر چلنے لگے۔

"تو چنتا نہ کر نمبردار! انت میں اچھائی کی برائی پر جیت ہوتی ہے۔" پجاری جی نے نمبردار کو چلتے چلتے آشیرواد دی۔ نمبردار سب کو ساتھ لے کر آگے بڑھ لیے تھے۔ کچھ یاد آیا، رکے اور گھوم کر دیکھا، پجاری جی وہیں کھڑے تھے۔ انہیں لگا

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شایع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں اُن کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جیسے پجاری جی کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر ساتھ کے آدمیوں کی وجہ سے کچھ سنکوچ میں ہیں۔ نمبردار کو کچھ یاد آیا۔ "ارے مہاراج ادھر میں بہت کام کاج میں لگا رہا، دھیان نہیں رہا۔ مندر کے گیہوں، گڑ اور کپڑے ابھی نہیں پہنچا پایا ہوں۔ آج ہی شام کو آدمی دے جائے گا۔"

مہاراج نے اطمینان کی سانس لے کر پھر آشیرواد دی۔ اس بار انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر بڑی والی آشیرواد دی تھی۔

بس اس ہیڈ ماسٹر کے بچّے کے خیالات اور معلوم ہو جائیں۔ انہوں نے امرائی کے پاس کمر جھکے شکستہ اسکول ماسٹر کو دیکھ کر سوچا، ہیڈ ماسٹر سے ان کے تعلقات عجیب نوعیت کے تھے۔ ضلع کلکٹر اور شہر کے پڑھے لکھوں کو دکھانے کے لیے گاؤں میں اسکول ہونا ضروری تھا اس لیے اسکول تھا۔ اسکول کا خرچا گرام پنچایت اُٹھاتی تھی جس میں ساری بات نمبردار کی چلتی تھی لیکن ہیڈ ماسٹر، نمبردار اُودل سنگھ کی جا و بے جا خوشامد نہیں کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ حرکت ایک معقول حرکت نہیں کہی جاسکتی۔ نمبردار کو دیہات کے بچّوں کی تعلیم بہت اکھرتی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ سارے لونڈے جنھوں نے اس اسکول میں تعلیم پائی تھی، ان سے اتنے خوش نہیں رہتے تھے جتنے وہ لونڈے جنھوں نے تعلیم نہیں پائی تھی۔ انہوں نے خفیہ طریقے سے اس بات کی بھی ٹوہ لگائی تھی کہ کہیں یہ ہیڈ ماسٹر بچّوں کو تعلیم دینے کے بہانے نمبردار کی برائیاں تو نہیں کرتا؟ اس جاسوسی کے نتیجے میں انہیں براہِ راست مثبت جواب نہیں ملا البتہ ٹوہ لینے والوں نے نمبردار کو یہ ضرور بتایا تھا کہ آج کل اسکول کی جو کتابیں چھپتی ہیں، ان میں خواہ مخواہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جنھیں پڑھ کر لونڈوں کو نمبردار کا خیال آجاتا ہوگا۔ مثلاً مہا بھارت کا وہ حصّہ کتاب میں ہونا کیا ضروری ہے جس میں کنس کا ذکر بہت نفرت سے کیا گیا ہے۔ اسی طرح رامائین کا پاٹھ راون کے ذکر کے بغیر بھی ہوسکتا ہے۔ انہوں نے تاریخ کی کتابوں پر بھی مدلل اعتراضات کیے اور کہا کہ ہیڈ ماسٹر جان بوجھ کر وہ حصّے بہت تفصیل سے دانت پیس پیس کر پڑھاتا ہے جن حصّوں میں، ہٹلر اور مسولینی وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ ان لوگوں کی نظروں سے معاشیات کی کتابوں کے وہ مخدوش حصّے بھی نہیں بچ سکے جنھیں پڑھ کر لونڈے خود کو سب کے برابر سمجھنے لگے ہیں۔ ادب کے وہ حصّے بھی مناسب نہیں تھے جن میں غریبی سے نفرت اور انقلاب کی ضرورت وغیرہ پر زور دیا گیا تھا۔

نمبردار نے نصاب سے متعلق اصلاحات کی یہ تجویزیں ہیڈ ماسٹر کے سامنے رکھی تھیں۔ ہیڈ ماسٹر حیران رہ گیا تھا، پھر ہنسنے لگا تھا۔ اس کی حیرانی تو کسی حد تک اُودل سنگھ کی سمجھ میں آئی تھی مگر ہنسی انہوں نے بدتمیزی پر محمول کی تھی۔

"آپ جانتے ہیں کہ آپ اس اسکول میں کس کی وجہ سے ہیڈ ماسٹر ہیں؟ میری وجہ سے، سمجھے۔"

ہیڈ ماسٹر نے دھیمی دھیمی آواز میں بتایا۔ "اوّل تو یہ کہ میں ہیڈ ماسٹر نہیں، صرف ماسٹر ہوں کیوں کہ میرے علاوہ اسکول میں کوئی ماسٹر نہیں۔ دوسرے یہ کہ میں بچّوں کو تعلیم دیتا ہوں اور اس کے بدلے میں گرام پنچایت مجھے مہینے مہینے یا کبھی تین تین مہینے بعد تنخواہ دیتی ہے۔ تیسرے یہ کہ اتنی کم تنخواہ میں تین ماسٹروں کا کام اس دیہات میں میرے سوا کون کرے گا؟"

نمبردار کو سچائی کے براہِ راست اور بے تکلف اظہار سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ "اگر میں گرام پنچایت سے کہلوا کر آپ کو نکلوا دوں تو؟" تو کہنے کے لیے جتنا منہ کھولنا ضروری ہوتا ہے، انہوں نے اس سے زیادہ کھولا اور دیر تک کھولے رکھا۔

"تو یہ ہوگا کہ گاؤں میں آپ کی تھو تھو ہوگی اور جب یہ بات قصبے تک پہنچے گی تو اگلے الیکشن میں آپ کے خلاف یہ بھی ایک نکتہ استعمال کیا جائے گا۔"

نمبردار نے اپنا بڑا سا کھلا ہوا منہ جلدی سے بند کرلیا کیوں کہ نمبردار اُودل سنگھ کی عقل یہاں تک نہیں گئی تھی، وہ ہیڈ ماسٹر کی اس اطّلاع سے نروس ہوگئے، تاہم انہوں نے پینترا بدل کر کہا۔ "میں نے تو ہیڈ ماصاب! آپ کی گہرائی جاننے کے لیے اتنی باتیں کیں۔ آپ کا رہنا اور یہاں رہ کر بچّوں کو تعلیم دینا گاؤں کی شوبھا بڑھاتا ہے بلکہ آپ مجھے کہنے دیجیے کہ یہ گاؤں آپ کے اور آپ کے اسکول کے بغیر ادھورا ادھورا لگتا ہے۔ اب آپ جاسکتے ہیں۔"

ہیڈ ماسٹر اپنی چرخ چوں سائی کل پر بیٹھ کر اسکول کی طرف بڑھ گیا تھا۔ انہیں ماسٹر کا ایک جملہ اور یاد آیا۔ "جنگلی جانور کو گڑ بادام کھلا کر اور سرسوں کا تیل پلا کر نمبردار نے اس کی بدھی بھرشٹ کردی ہے۔ یہ پراکرتی کے خلاف ہے۔" آج وہ

اسی ہیڈ ماسٹر کے پاس اسی نیلے کے بارے میں اس کی تازہ رائے جاننے کے لیے نکلے تھے۔

ہیڈ ماسٹر اسکول میں بیٹھا بچوں کو سبق پڑھا رہا تھا۔ نمبر دار ایک یاد سے بہت بچتے تھے۔ یاد آتے ہی خود کو اِدھر اُدھر بہکا لیتے تھے۔ مگر آج انہیں اس ہیڈ ماسٹر سے وہ عجیب و غریب پُراسرار ملاقات پھر یاد آئی۔ یہ جب کی بات ہے جب بڑکی کی عزّت کوٹی گئی تھی۔ اس پراسرار ملاقات سے کچھ دن پہلے کمہار کی بیوہ اور بڑکی اور چھٹکی نے اسکول کی چھٹی کے بعد اسکول کے باہر نیم کے درخت کے نیچے ماسٹر صاحب کا انتظار کیا تھا۔ جب وہ اسکول بند کر کے وہاں سے گزرے تو کمہارن نے ان کے پاؤں پکڑ کر رو رو کر کہا تھا کہ نمبر دار کا نیلا روزانہ ان کے محنت سے بنائے ہوئے برتن توڑ دیتا ہے۔ وہ آج شکایت لے کر ٹھاکر کے پاس گئیں تو ٹھاکر نے ہنس کر ان سے کہا کہ برتن توڑتا ہے، مٹّی تو نہیں کھا جاتا، مٹی پھر سے گوندھ گاندھ کر برتن بنا لیا کرو، اس میں اتنی پریشانی کی کون سی بات ہے جو مجھے کلیئو کے وقت پریشان کر رہی ہو۔

ہیڈ ماسٹر نے ان تینوں کو ڈھارس دی اور گڑھی میں جا کر نمبر دار کو سمجھایا۔ نمبر دار نے تو ہنس کے ٹال دیا مگر اونکار کا چہرہ سرخ ہو گیا جو وہیں کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔ گڑھی کے دروازے پر تینوں عورتیں کھڑی ماسٹر کا انتظار کر رہی تھیں۔ جب ماسٹر بڑے دروازے سے نکل رہا تھا تو اس نے اونکار کو غصّے کی حالت میں کمہارن اور اس کی بیٹیوں سے بات کرتے دیکھا۔ وہ ان تینوں کو ننگی ننگی گالیاں دے رہا تھا جنھیں آج اتنی ہمّت ہو گئی کہ وہ پنچایتی اسکول کے ماسٹر کو ان کے باپ کے پاس نیلے کی شکایت لے کر بھیجیں۔ ماسٹر کو آتا دیکھ کر اس نے نسبتہً شائستہ لہجے میں ان دونوں لونڈیوں کو کپڑے اتارنے والی نظروں سے دیکھ کر کہا تھا۔ "اوپر والے کا شکر کرو کہ ابھی نیلے ہی نے برتن توڑے ہیں، میں نے تو ابھی برتنوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔" وہ جاہل عورتیں کیا سمجھتیں مگر ماسٹر کا ماتھا ٹھنک گیا۔ وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔

جب بڑکی کا جھونپڑے والا واقعہ ہو گیا تو ایک رات ٹھاکر جیپ میں سوار گاؤں کی گڑھی تک آئے اور اُتر کر تھکے تھکے قدموں سے گڑھی کے دروازے پر پہنچے تو دُھند لکے میں انہیں ایک شخص رضائی اوڑھے کھڑا دکھائی دیا۔ وہ آدمی دھیمے دھیمے رو رہا تھا۔ انہیں اس پُراسرار شخص سے ڈر محسوس ہوا۔ وہ پہرے داروں کو آواز دینے ہی والے تھے کہ اس شخص نے رضائی سے منہ نکال لیا۔ اس کی بوڑھی آنکھیں سرخ اور گیلی تھیں۔ اس نے رندھی رندھی آواز میں ٹھاکر سے کہا۔ "نمبر دار جی! بڑکی کی عزّت معلوم ہے، کس نے۔۔۔۔؟"

"کس نے؟" ٹھاکر نے مری مری آواز میں پوچھا۔ انہیں اس سوال کے جواب اور ہیڈ ماسٹر کے اس پُراسرار روپ سے ڈر لگ رہا تھا۔

"اس نے، اُدھر دیکھو۔" ٹھاکر نے اس کی انگلی کے اشارے پر نظریں دوڑائیں، سامنے اندھیرے میں نیلا کھڑا تھا۔ ہیڈ ماسٹر انہیں حیران دیکھ کر ہنسا پھر اندھیری گلی میں غائب ہو گیا۔ ٹھاکر نے جلدی سے یہ یاد اپنے ذہن سے جھٹکی۔

نمبر دار اور ان کے ساتھ والوں کو دیکھ کر ماسٹر نے جلدی جلدی سبق ختم کرایا اور سیڑھیاں اُتر کر نیچے آیا اور سلام کر کے خاموش کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا۔ "میرا دل چاہتا ہے کہ آپ میرے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چل کر بیٹھیں۔" نمبر دار کو اس معمولی گزارش میں ایک طرح کی علامتی قسم کی گستاخی نظر آئی۔

"نہیں نہیں ہیڈ ماصاب! بس بہت دن سے آپ کو دیکھا نہیں تھا، سوچا، آپ سے سلام دعا کر لیں۔ ہم لوگ ادھر نیلے کو تلاش کر رہے ہیں۔ آپ نے تو نہیں دیکھا؟" نمبر دار نے ماسٹر کا چہرہ گہری نگاہوں سے کریدا اور اپنے ذہن کی داد دی۔ انہوں نے سمجھ لیا، ہیڈ ماسٹر کے سیڑھیاں چڑھا کر اوپر لے جانے والے جملے کا مطلب ہے کہ نمبر دار بھی اس کی شاگردی اختیار کر کے علم کی بلندیاں چڑھ کر اس کی اونچائی تک پہنچ جائیں۔ انہوں نے ایک بار پھر اپنی عقل کو داد دی اور ایک بار پھر ہیڈ ماسٹر کا چہرہ اپنی نظروں سے کریدا کیوں کہ ہیڈ ماسٹر کے چہرے پر شیو بڑھا ہوا تھا اس لیے وہ اسے اپنی نظروں کی مدد سے زیادہ نہیں کرید پائے۔

"نہیں، اِدھر تو نہیں دیکھا لیکن میں نے آپ کو پہلے ہی سمجھایا تھا کہ ایسا وحشی جانور اگر پالنا ہی ضروری ہے تو وہی کھان پان دیں جو اسے جنگل میں ملتا ہے اور اسے انسانوں کی صحبت سے دور رکھیں ورنہ اس کا وہ فطری ڈر ختم ہو جاتا ہے جو ہر جانور کو انسان سے محسوس ہوتا ہے۔"

نمبر دار کو اندازہ ہو گیا کہ ہیڈ ماسٹر کی نیلے کے بارے میں تازہ رائے کیا ہے۔ ہیڈ ماسٹر کی تازہ رائے اس کی باسی رائے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔

نمبر دار نے اسے علم کے وار سے گھائل کرنا مناسب سمجھا۔ "ہیڈ ماصاب! میرے بہت سے دوست ہیں، آسام سے لے کر گجرات اور ہمالا سے لے کر تامل ناڈو تک۔ آسام والے

نے قاضی رنگا سے ایک نیلا پکڑ کر پالا، گجرات والے نے گیر کے جنگل سے نیلا لا کر اپنے ساتھ رکھا، ترائی والے دوست نے ددھوا کے جنگل سے نیلا حاصل کیا اور تامل ناڈو والے نے باندی پور کے جنگل سے پکڑ کر اپنا پالتو بنایا مگر آپ کو میرے ہی نیلے میں ساری برائیاں نظر آتی ہیں۔"

"نمبر دار! آپ سچ سچ بتانا، کیا آپ کے دوستوں نے جو نیلے پالے، وہ بڑے ہو کر قیمتی غذائیں کھا کر، جنگل میں دوڑنے کی محنت اُٹھائے بغیر چارا کھا کر مست نہیں ہوئے؟ کیا بربادی نہیں مچائی؟"

نمبر دار نے اس بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ خود اپنے نیلے میں اتنی بُری طرح اُلجھے رہتے تھے کہ انہیں اپنے دوستوں کے نیلوں کا زیادہ دھیان ہی نہیں آتا تھا۔ انہوں نے بات بدلنے کی خاطر پوچھا۔ "اچھا تو ماسٹر صاب! آپ ہی بتاؤ اب کیا کیا جائے؟"

"پہلے تو آپ نیلا ڈھونڈیے وہ جہاں بھی جائے گا، آفت مچائے گا۔ اُس کی عادتیں خراب ہو چکی ہیں۔ اُسے ڈھونڈ کر اپنے پاس باندھ کر رکھیے اور آہستہ آہستہ اس کی بُری عادتیں چھڑائیے، اس کی غذا بدلیے۔ اسے پھر سے اس کی فطری غذا پر لائیے۔ حالانکہ اس میں پریشانی ہو گی مگر یہ تو اب کرنا ہی پڑے گا۔ جب وہ اپنی غذا کا عادی ہو جائے تو اسے میدانوں میں چھوڑ آئیے۔ اس بیچ اُس کی چربی بھی کچھ کم ہو چکی ہو گی اور چربی کم ہونے سے وہ میدان میں دوڑنے میں تکلیف محسوس نہیں کرے گا۔ میدانوں میں بھاگ دوڑ کر کے جب اُسے اپنی جنگل کی غذا ملے گی اور اُسے اپنے ساتھی ملیں گے اور مادائیں ملیں گی تو اس کا جُنون ختم ہو جائے گا اور وہ اپنی فطری زندگی کا عادی ہو جائے گا۔

"لیکن میری گڑھی اور حویلی کا کیا ہو گا؟" ٹھاکر کے منہ سے نکل پڑا۔

"اس کا کیا مطلب؟"

ٹھاکر کو اندازہ ہو گیا کہ ان کے منہ سے حماقت کی بات نکل گئی یعنی صحیح بات نکل گئی، فوراً پہلو بدل کر بولے۔ "مطلب گڑھی اور حویلی میں اسے دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ وہ نظر نہیں آئے گا تو کتنا بُرا لگے گا۔"

"نمبر دار جی! گڑھی اور حویلی میں اپنے بیٹے اور بہو اور پوتے پوتی اور گاؤں والوں اور قصبے والوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کیجیے اور انہی میں اپنی تفریح کا سامان پیدا کیجیے۔ انہی میں آپ کی زندگی ہے اور انہی سے آپ کی زندگی ہے۔ بھگوان کے لیے

اب اپنا شوق ختم کیجیے، آپ کا یہ شوق اس جانور کو بھی بھاری پڑ رہا ہے، گاؤں اور قصبے والوں کو بھی، گڑھی اور حویلی میں بھی بربادی مچی ہوئی ہے۔ آج جا کر آپ من لگا کر سوچیے کہ کیا کارن ہے جس کی وجہ سے آپ کو نیلے کی چاہ ہے۔ جب وہ کارن سمجھ میں آ جائے تو اس کارن کی جڑ کاٹ کر پھینک دیجیے۔"

نمبر دار اُودل سنگھ واپس آئے تو بظاہر وہ اپنے ساتھ والوں سے ہیڈ ماسٹر کی حماقت آمیز باتوں پر ہنس ہنس کر جملے کس رہے تھے لیکن اندر انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ جاہل ہیڈ ماسٹر نے ان کی دُکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔

گڑھی میں آ کر وہ چھت پر چڑھ گئے اور وہاں انہوں نے دور مندر کے کھیت میں کھڑے نیلے کو محسوس کیا اور اس بات سے مطمئن ہوئے کہ سردیوں کا زمانہ ہے ورنہ گرمی ہوتی تو نیلا اتنی دیر تک کھیت کی گرمی کی تاب نہ لا پاتا۔ وہیں کھڑے

فرمودات

امریکہ کے سابق صدر ابراہیم لنکن سے ایک بار کسی نے سوال کیا۔ "آپ کی کامیابی کی خاص وجہ کیا ہے؟" لنکن نے جواب دیا۔ "میں کبھی دوسروں پر نکتہ چینی کر کے اُن کا دل دُکھانے کی کوشش نہیں کرتا۔" امریکہ کے ایک اور سابق صدر ہنری فورڈ سے بھی یہی سوال کیا گیا تھا۔ جواب میں فورڈ نے کہا۔ "میں دوسروں کے نقطۂ نظر کو بھی اتنی ہی اہمیّت دیتا ہوں جتنی اپنے نقطۂ نظر کو۔"

☆ جو شخص یہ جانتا ہے کہ وہ بے وقوف ہے، وہ دُنیا کا سب سے عقل مند آدمی ہے لیکن جو بے وقوف ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی بے وقوفی سے لاعلم بھی ہے، وہ دُنیا کا سب سے بڑا بے وقوف ہے۔

سقراط

☆ انسان کو قانون اور آزادی دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ قانون اس کی جنگ جویانہ اور استحصالی فطرت قابو میں رکھنے کے لیے اور آزادی تخلیقی صلاحیتوں کے فروغ اور عوام کی فلاح کے لیے۔

برٹینڈرسل

☆ بیس سال کی عمر میں انسان کا جو چہرہ رہتا ہے، وہ قدرت کی دین ہے، تیس سال کی عمر کا چہرہ زندگی کے نشیب و فراز کی دین ہے اور پچاس سال کی عمر کا چہرہ انسان کی اپنی کمائی۔

اشٹاوک

☆ دوسروں کو ناکام بنانے کی کوششیں خود ہمیں ناکام بناتی ہیں۔

ایمرسن

کھڑے انہوں نے نیلے سے پیدا ہونے والی دہشت محسوس کی اور اس دہشت کے سائے میں قطرہ قطرہ بڑھتی دولت اور انچ انچ بڑھتے اقتدار اور اختیار کا لقمہ لقمہ ہضم کیا اور جب وہ سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہے تھے تو ایک طرف ان کا ذہن کہہ رہا تھا کہ نیلے سے چھٹکارا حاصل کر لو اور دوسری طرف کوئی چپکے چپکے کہہ رہا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔

جب وہ آنگن میں آکر مونڈھے پر بیٹھے تو چراغ جل چکے تھے۔ باہر سے پہرے دار دوڑتے ہوئے آئے اور انہیں اطّلاع دی کہ نیلا ارہر کے کھیت سے رسّی تڑا کر بھاگ لیا ہے۔ ان کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ قصبے میں پہنچ جائے۔ اب کوئی بربادی ہوئی تو بڑی بدنامی ہو گی۔

وہ جیپ پر بیٹھ کر ہَوا کی رفتار سے قصبے کی طرف روانہ ہوئے۔ پرتاپ روکتا ہی رہ گیا۔

قصبے کی گلیوں میں اسٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی تھی لیکن انسان نہیں تھے۔ سب اپنے اپنے گھروں میں کنڈی لگائے بیٹھے تھے۔ چوراہوں پر پولیس والے کھڑے سیٹیاں بجا رہے تھے اور آوارہ کتّے خلافِ معمول اتنی جلد بازار سُونا دیکھ کر منحوس آواز میں رونے لگے تھے۔

نیلا قصبے میں کسی بھی گھر کے پاس کھڑا مل سکتا ہے یا ہو سکتا ہے، قصبے کے باہر کھیت یا کسی اُجڑے ہوئے باغ میں کھڑا ہوا۔ حویلی تک جانے والی سڑک کے ایک موڑ پر جیسے ہی وہ مڑے، انہیں ایک سایہ سا نظر آیا۔ خوف کی ایک ٹھنڈی لہر ان کی گدّی سے ہوتی ہوئی پوری پیٹھ پر پھیل گئی۔ یہ نیلے ہی کا سایہ ہو گا کیوں کہ انسان تو سارے اس کے ڈر سے گھروں میں بند بیٹھے ہیں۔

حویلی کے صحن میں جا کر انہوں نے نیلے کو ہر طرف تلاش کیا، وہ کہیں نہیں ملا۔ بجلی چلی گئی تھی اور رات بالکل تاریک تھی۔ وہ بیٹھک میں اکیلے بیٹھے سوچتے رہے اور ڈرتے رہے۔ رات کے بارہ بجے کے بعد کسی وقت ان کی آنکھ لگ گئی۔

اچانک پورے قصبے میں چیخ پکار کی لپٹیں اُٹھنے لگیں۔ حویلی کے نوکروں میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔ وہ جلدی سے اُٹھے اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اندھیرے میں کوئی جانور تیز تیز سانس لیتا ہوا بھاگا جا رہا تھا۔ وہ اندازہ نہیں کر پائے کہ وہ کدھر گیا۔ اچانک پھر ایک جانور مخالف سمت سے بھاگتا ہوا آیا اور دوڑتا چلا گیا۔

انہوں نے سامنے کی گلی کی طرف نگاہ اُٹھائی، وہاں بھی ایک سیاہ سایہ کھڑا تھا۔ انسانوں کا شور اور پولیس کی سیٹیوں کی آوازیں اب بھی تھمی نہیں تھیں۔ انہوں نے گلی کی طرف پھر دیکھا۔ اب وہ سایہ وہاں نہیں تھا۔

❁ اس رات ایک ساتھ ۱۲ وارداتیں ہوئیں۔ قصبے کے کونے والے محلّے کے ایک ہی خاندان کے تین گھروں کے دروازے ٹوٹے ہوئے پائے گئے۔ بزریا کی پانچ دکانوں کے شٹر ٹیڑھے ہو گئے تھے اور اندر کی جنس دکانوں میں چاروں طرف بکھری ہوئی ملی تھی۔ تین پولیس والوں پر کسی جانور نے اندھیرے میں حملہ کیا جو بڑے نالے کی پلیا پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میونسپل بورڈ میٹنگ ہال کا دروازہ توڑ کر پندرہ کرسیاں سیٹے کے قلم کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی تھیں۔ جو وارداتیں کچّی زمین پر ہوئی تھیں، وہاں جانور کے کھروں کے نشان پائے گئے تھے۔

میونسپل بورڈ کے آفس میں ضلع کلکٹر متفکر بیٹھا تھا۔ ٹھاکر اُودَل سنگھ اور محمود صاحب اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ قصبے کا دورہ کر کے ایس پی صاحب جیپ سے اُترے، ان کے ساتھ ہی قصبہ انچارج کودا۔ ہال میں آکر ایس پی صاحب ایک کرسی کھینچ کر کلکٹر صاحب کے برابر بیٹھ گئے۔ قصبہ انچارج سامنے آکر اٹینشن کھڑا ہو گیا۔

"آرام سے۔" ایس پی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ آرام سے ہو گیا۔

"آپ نے نتیجہ دیکھ لیا؟" کلکٹر نے خاموشی توڑی۔

نمبردار چپ بیٹھے رہے۔ محمود صاحب نے بھی سر جھکا لیا۔ اُودَل سنگھ کی بدنامی اور بے عزّتی اتنی واضح تھی کہ محمود صاحب کی مزید کمک کی ضرورت نہیں تھی۔

"مگر یہ ساری وارداتیں ایک ہی نیلے کی کارستانی نہیں ہیں۔" ایس پی نے انکشاف کیا۔

"آپ کا مطب ہے کہ کئی نیلے ہیں؟" کلکٹر صاحب نے پوچھا۔

"نہیں، یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن پولیس والوں کا بیان تھا کہ ان پر جو حملہ ہوا، اس میں ایک سے زیادہ جانور ملوث تھے۔" ایس پی کے اس جملے سے نمبردار اُودَل سنگھ کے بدن میں کچھ جان پڑی۔

"یہ کیا معاملہ ہے۔ کچھ اندازہ ہے؟"

"قصبہ انچارج سے بات چیت کے دوران اندازہ ہوا کہ کچھ روز پہلے کانجی ہاؤس سے نیلے نے جن بجاروں کو آزاد کرا لیا تھا، وہ اس کے ملزم ہو سکتے ہیں۔ کئی دنوں کے بھوکے پیاسے بجار رات کو اپنی اپنی پناہ گاہوں سے نکلے ہوں گے اور پانی پینے نالے پر آئے ہوں گے۔ وہاں سپاہی بیٹھے اونگھ رہے تھے، یا

کے حصول میں مزاحم سمجھ کر حملہ بول دیا ہوگا۔"

"کیا نیلے اور بجار کے کھر کے نشان میں فرق محسوس ہو سکتا ہے؟" کلکٹر صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں سرکار!" قصبہ انچارج بولا۔ "مگر ہَوا اتنی چلی کہ ان کے کھر آدھے ہیں، آدھے غائب۔ اب پہچان مشکل ہے۔"

نیلے کے کھر کی پہچان والی بات سن کر نمبردار اُودَل سنگھ نے بازی پلٹتی محسوس کی، فوراً بولے اور کیوں کہ اس بار پہلی مرتبہ بولے تھے اس لیے بات دھیان سے سنی گئی۔ "صاحب! بزریا کی دکانیں توڑ کر سامان کون اُٹھالے گیا۔ یہ حرکت جانور نہیں کر سکتا۔"

یہ سن کر ایس پی اور تھانا انچارج نے سر جُھکا لیا۔ تھانا انچارج کا لمبوترا چہرہ اس کے سینے پر ٹک گیا اور دیر تک ٹکا رہا۔

کلکٹر نے مسوری کی تربیت کے دوران بڑی نادر و نایاب باتیں سیکھی تھیں اس لیے وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "اصل معاملے سے توجہ نہیں ہٹنا چاہیے۔ جب جڑ کا علاج ہو جائے گا تو باقی باتیں خود بخود درست ہو جائیں گی۔ اس پورے فتنے فساد کی بنیاد ہے دراصل ٹھاکر صاحب کا نیلا، جو اَب پاگل ہو چکا ہے۔ اس وقت اسی کے بارے میں گفتگو کرنا چاہیے، اب آپ بتائیے ٹھاکر صاحب کہ آپ کا فیصلہ کیا ہے؟"

"جس میں سب کی بھلائی ہو۔" ٹھاکر دل کڑا کر کے بولے۔

"اگر وہ ہاتھ آجائے تو اس کا کیا کیا جائے؟" کلکٹر نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"میرے حوالے کر دیا جائے۔ میں اسے دوبارہ جنگل کی عادت ڈال دوں گا پھر اس کا پاگل پن ختم ہو جائے گا۔" ٹھاکر اُودَل سنگھ نے ہیڈ ماسٹر والا سبق یاد کرنے کی کوشش کی۔

"آپ کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ پھر آزاد ہو کر تباہی مچائے۔" کلکٹر نے استہزا کے انداز میں کہا۔

ٹھاکر صاحب کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا کلکٹر کو معلوم ہے کہ وہ میرے ہاتھ آکر نکل چکا ہے۔ پھر انہوں نے خود کو تسلی دی کہ کلکٹر نے یہ بات یوں ہی رواروی میں کہہ دی ہے۔

"سنیے جناب! رائے عامہ کا زبردست دباؤ ہے۔ دیگر قصبے والوں نے بھی شکایت کی ہے کہ نیلا ان کے ہاں بھی تباہی مچا رہا ہے۔ کل نیلا شہر میں بھی دیکھا گیا ہے۔ اب یہ معاملہ مقامی نہیں رہا لیکن نیلا کیوں کہ آپ سے وابستہ ہے۔ اس کا مقام واردات خاص طور پر یہ قصبہ ہے اس لیے آپ دونوں حضرات قصبے کے معزز شہری کی حیثیت سے اس کاغذ پر دستخط کیجیے کہ نیلے کی وحشیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے نیلے کو مارنا مناسب ہوگا۔ یہ درخواست وائلڈ لائف افسر کے نام ہے۔ میں ان سے اجازت نامہ پیشگی حاصل کر چکا ہوں۔ یہ دیکھیے۔" انہوں نے کوٹ کی جیب سے سرکاری مہر والا ایک کاغذ نکال کر دکھایا۔

"محمود صاحب نے تیزی سے اور ٹھاکر صاحب نے مرے مرے ہاتھوں سے کلکٹر کے دیے ہوئے کاغذ پر دستخط کیے۔ محمود صاحب نے شکر ادا کیا کہ کلکٹر اور ایس پی، کسی نے بھی میونسپل بورڈ کے آفس کی توڑ پھوڑ کے بارے میں کسی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ٹھاکر اُودَل سنگھ نے دستخط کرنے کے بعد سوچا کہ یہ مرحلہ ختم ہو تو وہ جلد از جلد گڑھی اور حویلی کی ساری دولت نکال کر شہر کے اُس بینک میں رکھ دیں گے جہاں پچھلے ہفتے ہی ایسے لاکر تقسیم ہونے شروع ہوئے ہیں جنھیں حاصل کرنے کے لیے نام کا اندراج نہیں کرنا پڑتا بلکہ کوڈ نمبر دے دیا جاتا ہے۔

"مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جانور واردات کر کے چُھپ کہاں گئے ہیں؟" ایس پی صاحب بولے۔

"میں کچھ کہوں گا تو کہا جائے گا کہ نیلے کی حمایت میں بول رہا ہوں۔ آپ یقین کیجیے، میں نے رات کو چیخ پکار کے بعد اپنی کھڑکی سے تین نیلے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔" ٹھاکر نے رات کا منظر یاد کیا اور جھرجھری لے کر بولے۔

"کیا وہ نیلے ہی تھے؟" ایس پی نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ لیکن وہ جانور یقیناً تھے۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔

"ممکن ہے، ٹھاکر صاحب کا نیلا جنگل سے اور وحشی نیلوں کو لگا لایا ہو جو اس کے بدن کی موٹی چربی دیکھ کر لالچ میں آگئے ہوں۔" کلکٹر نے کہا۔

"ممکن ہے، قصبے کے عام جانوروں نے نیلے کی وحشت کی شہرت کا فائدہ اُٹھایا ہو۔" ایس پی نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"لیکن یہ سب کچھ بہت خطرناک اور پُراسرار ہے۔" محمود صاحب نے کہا۔ وہ چاہتے تھے کہ گفتگو نیلے اور دیگر جانور ہی سے متعلق رہے، میونسپل بورڈ آفس کی توڑ پھوڑ کا ذکر نہ آپائے۔

"لیکن بنیاد وہ نیلا ہی ہے۔" کلکٹر نے کہا اور دل ہی دل میں سوچا کہ دور دراز کی ساری بستیوں سے بربادیوں کی خبریں آرہی ہیں، ان سب کا سبب تو یہ اکیلا نیلا نہیں ہو سکتا۔ "تمام علاقوں میں کل ملا کر کتنے پالتو نیلے ہیں؟"

"وہ اگر ختم بھی ہو جائے تو اس کے ساتھ کے نیلے اور کانجی ہاؤس کے بجاروں کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔" ایس پی نے ان کا دھیان بٹایا۔

"ارے پہلے اس ایک نیلے کو قابو میں کیجیے کپتان صاحب!" کلکٹر نے فکر مند مسکراہٹ کے ساتھ کہا جس میں کچھ کچھ طنز کی چمک بھی تھی۔

اس جملے کے بعد سب نے اپنے اپنے سر جُھکا لیے۔ خود کلکٹر صاحب کا سر بھی اُٹھا ہوا نہیں تھا۔

دور آفس سے ملحق پارک کی سیڑھیوں پر کچھ شور سا ہوا۔ گڑھی کا پہرے دار ہانپتا کانپتا روتا چلّاتا بھاگا چلا آرہا تھا۔

آفس میں گھس کر اس نے نمبردار کے پیر پکڑ کر کہا۔ "نمبردار جی! نیلا گڑھی میں آگیا ہے۔ بڑی بہو کے کمرے پر ٹکریں مار رہا ہے۔ پرتاپ بھیّا اور بچّے بھی کمرے ہی میں ہیں۔"

باہر سے کلکٹر کا باڈی گارڈ ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ "شہر سے وائرلیس میسج آیا ہے کہ وہاں وہی واردات ہو گئی ہے۔"

کلکٹر اور ایس پی شہر روانہ ہونے سے پہلے تھانا انچارج کو نیلا مارنے کا اجازت نامہ اور ضروری ہدایتیں دے گئے۔ وہ جیپ پر چڑھتے چڑھتے وعدہ کر گئے کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر پولیس کی مزید ٹکڑیاں بھیج دیں گے۔

ٹھاکر صاحب کے سینے میں پنکھے چل رہے تھے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ کانپتے قدموں سے جیپ پر چڑھے اور چند ہی منٹوں میں لیکن اپنے حساب سے کئی گھنٹوں میں دیہات پہنچ پائے۔

گڑھی کے سامنے چھٹکی کا جھونپڑا چڑیا کے گھونسلے کی طرح الجھا الجھا پڑا تھا۔ گاؤں کے سب لوگ دہشت زدہ اپنے اپنے گھروں میں بند تھے۔ جھونپڑے کے باہر چھٹکی کی کھوندی ہوئی لاش پڑی تھی۔ بچّے کمرے میں بند تھے، پرتاپ اور بڑی بہو گڑھی کے دروازے کی سلاخوں سے لگے کھڑے کانپ رہے تھے۔ نیلے کا دور دور نام و نشان نہیں تھا۔

"وہ ہمارے دروازے پر ٹکّریں مار مار کر لہولہان ہو گیا تھا۔ دروازہ بہت مضبوط تھا، ٹوٹا نہیں۔ وہ گڑھی میں چاروں طرف بھاگ بھاگ کر کسی کو تلاش کر رہا تھا۔ شاید آپ ہی کو تلاش کر رہا تھا۔ چاروں طرف سے اس پر یورش ہے، بس آپ ہی کو اپنی پناہ سمجھتا ہے۔" پرتاپ نے پُھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتایا۔

"جیسے ہی وہ گڑھی سے نکلا، ہم نے کمرے سے نکل کر گڑھی کا دروازہ بند کر لیا۔ وہ چھٹکی کے جھونپڑے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔۔۔" بڑی بہو کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر اس نے ڈر سے کانپتے ہوئے شرم سے آنکھیں جُھکائے ہوئے بتایا۔ "اپنے جھونپڑے میں چھٹکی ہر مہینے کپڑے کے چیتھڑے اُڑس دیتی تھی۔ جیسے ہی وہ اس دفعہ کے چیتھڑے اُڑس کر مڑی، نیلا پیچھے کھڑا تھا۔ وہ چیخ کر جھونپڑے میں گھس گئی اور ٹٹر بند کر لیا۔ نیلے نے گردن اُٹھا کر وہ چیتھڑے سُونگھے اور انہیں سُونگھتے ہی دو پیروں پر کھڑے ہو کر دیوانوں کی طرح زمین پر لوٹیں لگانے لگا"۔۔۔ بڑی بہو بیان کرتے کرتے تھک گئی تھی۔

تب پرتاپ نے واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔ "پھر وہ اُٹھا اور پیروں پر کھڑا ہو کر کسی اَن دیکھے انسان سے لڑنے لگا جیسے کسی پر قابو پانا چاہتا ہو۔ پھر اس نے چھٹکی کی چیخیں سنیں۔ اس نے سینگوں کے ایک ہی ریلے میں ٹٹر توڑ دیا اور اگلی ٹانگیں اُٹھا اُٹھا کر چھٹکی کو کھوندنا شروع کر دیا۔ جب وہ بے دَم ہو کر گر پڑی تو نیلے نے چھپّر کا تنکا تنکا الگ کر دیا۔" پرتاپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے جو مسلسل بہہ رہے تھے مگر بیان کے زور میں وہ انہیں پونچھنا بھی بھول گیا۔

انچارج نے چھٹکی کی لاش کا پنچ نامہ کرا لیا اور شہر روانہ کر دیا۔ انچارج نے ٹھاکر صاحب کے پاس آکر سرگوشی کی۔ "وہ آپ ہی کی چاہ میں ہے۔ شاید آپ کے قابو آسکے۔ ویسے تو اب اسے مارنے کا اجازت نامہ بھی میرے پاس موجود ہے۔"

کھیتوں کی طرف سے ہیڈ ماسٹر دوڑتے ہوئے آئے اور بتایا کہ انہوں نے ابھی ابھی نیلے کو مندر والے کھیت میں گھستے دیکھا ہے۔

پولیس کی کئی جیپیں رُکیں۔ شہر سے کمک آگئی تھی۔

ٹھاکر اُودَل سنگھ نے سوچا، اس بیچ نیلے کو اپنی غذا کہیں نہیں ملی ہوگی اسی لیے وہ مندر والے ارہر کے کھیت میں چلا گیا ہے۔ وہاں اب بھی اناج گڑ اور بادام رکھے ہوں گے اور ناند میں پانی بھی بھرا ہوگا اور وہاں کوئی آدمی بھی نہیں ہوگا۔

تھانا انچارج نے گالیاں دے دے کر گاؤں کے مرد گھروں سے نکالے۔ سب اس بات پر راضی ہو پائے کہ ارہر کے کھیت تک ٹھاکر اُودَل سنگھ بھی جائیں گے۔

"کیا میں اُسے مرتے ہوئے دیکھ سکوں گا؟" ٹھاکر اُودَل سنگھ نے اپنے آپ سے پوچھا، ان کے دل نے جواب دیا کہ شہر میں نئے طریقے کے لاکر آگئے ہیں۔ انہوں نے کھیت پر جانے کی ہامی بھر لی۔

تھانا انچارج نے سپاہیوں کو گاؤں کے چاروں طرف بندوقیں لے کر کھڑا کر دیا اور مختلف ہدایتیں دے کر سب کے مورچے درست کرائے۔

لاٹھی، ڈنڈا، سانٹھا جو جس کے ہاتھ آیا، لے کر ارہر کے کھیت کی طرف چلا۔

"تم دونوں بچّوں کو لے کر اپنے کمرے میں بند ہو جاؤ مگر

گڑھی کا دروازہ کُھلا رکھنا۔ شاید۔۔ بھاگ کر اِدھر ہی آئے۔ اگر وہ گڑھی میں آیا تو میں دروازہ بند کر کے اُسے رام کر لوں گا۔"
ٹھاکر صاحب نے پرتاپ اور بڑی بہو کو ہدایت کی۔

ہانکا ہونے کے بعد ارہر کے کھیت سے نکلتے ہی تھوتھنی اور سر پر لاٹھیاں اور ڈنڈے لگاتار پڑے۔ سیاہ بدن پر جگہ جگہ خون اُبل رہا تھا۔ وہ بھاگا۔ اس کی آنکھ بھی زخمی ہو گئی تھی اسی لیے وہ ٹیڑھا ٹیڑھا بھاگ رہا تھا۔ ٹھاکر اُودَل سنگھ اسے گاؤں کی طرف بھاگتا دیکھ کر پوکھر والے راستے سے تیزی کے ساتھ گڑھی کی طرف بڑھے۔ لاٹھیاں لیے ہجوم لمبے والے راستے سے اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ نیلے نے چہرے سے بہتے ہوئے خون کی چادر کے پیچھے سے کچھ اجنبی شکلیں گاؤں کی سرحد پر دیکھیں۔ اس نے کاوا کاٹا اور گڑھی کے پیچھے والے راستے یعنی ٹوٹی ہوئی دیوار سے داخل ہو کے وہ گڑھی کے صحن میں آ گیا۔ پرتاپ اور بڑی بہو بچوں کو کمرے کے اندر کر کے خود باہر کھڑے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ٹوٹی ہوئی دیوار کے رستے سے آ جائے گا۔ دونوں بجلی کی سی تیزی سے کمرے کی طرف بھاگے جس کے دروازے میں بچے کھڑے دیوانوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ بڑی بہو کا پیر ساڑی میں اٹکا اور وہ لڑکھڑا گئی۔ پیچھے آتا ہوا پرتاپ اس سے ٹکرایا اور رک گیا۔ بہو کمرے کے اندر داخل ہو چکی تھی اور پرتاپ نیلے کے سینگوں سے اُلجھا ہوا تھا۔ بڑی بہو اضطراری طور پر کمرے سے باہر آئی تو بچے بھی ماں سے لپٹ کر باہر آ گئے۔ وہ گھوم کر بچوں کو پکڑ کر کمرے میں بھاگی۔ مڑی تو دیکھا کہ نیلا اپنی پچھلی ٹانگوں پہ کھڑا ہوا اگلے کھروں سے پرتاپ کا سر پاش پاش کر چکا ہے۔ جب دھول کچھ کم ہوئی تو بڑی بہو نے حیران حیران خالی خالی آنکھوں سے دیکھا کہ پرتاپ زمین پر پرانے لحاف کی طرح اُدھڑا پڑا ہے اور نیلا خون کی دھاریوں کے پیچھے سے اپنی آنکھیں پٹ پٹ کھول رہا ہے، بند کر رہا ہے اور پرتاپ کی لاش کے چاروں طرف ٹکراتا، اُلجھتا، لڑکھڑاتا ہوا چکر لگا رہا ہے اور گڑھی کے دروازے سے نمبر دار اُودَل سنگھ دیوانوں کی طرح چیختے چلّاتے داخل ہو رہے ہیں۔

اسے بہت دُھندلا دُھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ ایک آنکھ شاید بالکل ختم ہو گئی تھی اور دوسری سر سے بہنے والے خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔ نیلے نے خون سے لتھڑی آنکھیں پٹ پٹائیں اور اتنے زور سے سانس بھری کہ اس حصّے کی مٹّی اُڑنے لگی۔ اس نے گردن جھٹکی، دم کو گردش دی اور سینگ آگے کر کے پوری طاقت سے اُودَل سنگھ سے ٹکرا کر اسے دیوار تک روندتا چلا گیا۔ جب دیوار سے اُودَل سنگھ کا سر ٹکرا گیا تو سینگ گھونپ گھونپ کر اس کی آنتیں نکال کر اپنے کھروں سے کھوندتا رہا اور پھر وہاں کسی کو نہ پا کر ٹوٹی ہوئی دیوار کا راستہ یاد کے سہارے تلاش کرتا ہوا گڑھی سے نکل گیا۔

بڑی بہو اپنے بچّوں کو لے کر چپ چاپ کمرے سے نکلی۔ اس نے پرتاپ اور بابو جی کی لاشوں کے درمیان کھڑے ہو کر بچّوں کو مضبوطی سے پکڑا اور آسمان کی طرف دیکھا۔

پولیس کی ٹکڑیاں اور گاؤں کا مجمع گڑھی کے دروازے پر اکٹّھا ہو گیا تھا۔ انہیں علم نہیں تھا کہ اندر کیا ہوا۔ انہیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ نیلا پیچھے والے راستے سے نکل کر، تالاب پار کرتا ہوا، خون کی چپ چپاہٹ سے بند ہوتی آنکھیں دھوتا ہوا زخمی حالت میں کدھر بھاگا ہے۔

پھر سب کو اس بات کی خبر ہوئی کہ زخمی، اندھا اور پاگل نیلا غاءب ہو گیا ہے۔

تھانے دار نے تھکے تھکے ہاتھوں سے رائفل خالی کی اور سوچا، کیوں کہ وہ زخمی ہے اس لیے کہیں بھی مر سکتا ہے۔

گڑھی کے کچّے صحن پہ ننگے پاؤں کھڑی بڑی بہو نے دونوں بچّوں کے ہاتھ مضبوطی سے تھامے، آنکھیں بند کیے دل کڑا کر کے سوچا، کیوں کہ وہ اندھا ہے اس لیے اب کسی کو بھی نہیں پہچان سکتا۔

بوڑھے ہیڈ ماسٹر نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں چُھپائیں اور سوچا کہ وہ پاگل ہے اس لیے کبھی بھی حملہ کر سکتا ہے اور کیوں کہ وہ غایب ہے اس لیے کوئی بھی گلی پار کرتے ہوئے کسی بھی کھیت کی طرف جاتے ہوئے اور کسی بھی راستے پہ چلتے ہوئے اچانک بالکل سامنے، بالکل قریب کھڑا نظر آ سکتا ہے۔ سینگ آگے کیے، سر نہوڑائے اور اگلے کھر فضا میں بلند کیے۔

لیکن کسی کو بھی یہ سوچنے کی سکت نہیں تھی کہ نیلا گاؤں ہی میں ہے یا گاؤں کے پاس کسی کھیت میں چُھپا ہوا ہے یا گاؤں کی سرحد سے دور قصبے تک پہنچ گیا ہے یا قصبے سے بھی آگے خون کے چھینٹے اُڑاتا شہر کی طرف بھاگ رہا ہے یا اس سے بھی آگے۔

پانچویں مُنتخب کہانی

ہربھجن سنگھ ساگر

ایک دیہی عورت کی کہانی، اُسے شہر اور شہریوں کا تجربہ نہیں تھا۔

جانے وہ کس زمانے کی بڑھیا تھی۔

شاید پہلی بار شہر آئی تھی۔ شہر آتے وقت وہ اپنے ساتھ عام ضرورت کی چیزوں کے علاوہ کچھ چھوٹی موٹی چیزیں بھی لے آئی۔ اپنے بڑھاپے کا سہارا ایک چھڑی، دھوپ، بارش سے بچنے کے لیے ایک چھتری، پھٹے پرانے کپڑے سینے کے لیے سُوئی دھاگا اور اندھیروں میں روشنی پھیلانے کے لیے مٹّی کا ایک دیا اور لالٹین۔ چھڑی، چھتری یا سُوئی دھاگے کی ضرورت تو سمجھ میں آتی ہے لیکن شہروں میں بھلا مٹّی کے دیے یا لالٹین کی کیا ضرورت؟ ہر رات چاروں طرف بجلی کی روشنی کا سیلاب سا پھیلا ہوتا ہے۔

بے چاری بڑھیا شہر میں بجلی سے آنکھیں چندھیا دینے والی روشنی دیکھ کر مٹّی کے دیے اور لالٹین کے بارے میں سوچنا ہی بھول گئی اور یہ بے کار کی چیزیں کمرے کے ایک کونے میں پڑی پڑی بھولی بِسری یادیں بن گئیں۔ لالٹین تو مکڑی کے جالے کے اندر ہی گم ہو گئی۔

لیکن ایک دن اچانک سارے شہر کی بجلی گُل ہو گئی۔ یوں محسوس ہونے لگا گویا سارا شہر کسی اندھے کنویں میں گر پڑا ہو۔ لیکن بڑھیا نہ گھبرائی۔ وہ اندھیروں سے بخوبی واقف تھی۔ اس کی زندگی تو اندھیرے دیکھتے ہی بسر ہوئی تھی۔ اندھیرا ہو گیا تو کیا ہوا، روشنی کا نسخہ بھی تو اس کے پاس موجود ہے۔ وہ جھٹ سے اٹھی اور مٹّی کا دیا جلا کر اس نے کمرے میں روشنی کر لی۔

دیے کی روشنی مکڑی کے جالے پر پڑی۔ جالے کے اندر لالٹین کا شیشہ ایسے مسکرایا گویا چھت پر لٹکے ہوئے بجلی کے بلب پر ہنس رہا ہو۔ عادت کے مطابق بڑھیا نے لالٹین کا شیشہ صاف کیا اور اسے جلا کر باہر گلی میں رکھ دیا تاکہ آتے جاتے لوگوں کو چلنے میں پریشانی نہ ہو اور وہ اندھیری گلی میں اندھوں کی طرح راستہ ٹٹولتے نہ پھریں۔ گلی میں لالٹین رکھ کر بڑھیا گویا کسی بہت بڑی ذمّے داری سے سبک دوش ہو گئی اور بے فکر ہو کر کمرے میں چلی آئی۔

گلی سے تاریکی کا خوف جاتا رہا۔ کچھ دیر بعد ایک راہ گیر گلی سے گزرا۔ راستے میں جلتی ہوئی لالٹین دیکھ کر وہ حیران ہوا
"ہونہہ ..... لالٹین! شاید کوئی بھول گیا ہے۔ لیکن ..... لیکن تاریکی میں روشنی کیسے بھولی جا سکتی ہے۔ روشنی تو سب کی ضرورت ہے۔ چلو کچھ بھی ہو، اب یہ لالٹین میرے راستے میں اُجالے کرے گی"۔ راہ گیر نے جھپٹ کر لالٹین اٹھا لی۔ لالٹین کی روشنی میں وہ ایک بھیانک کالی پرچھائیں میں ڈھل گیا، ایک دیو قامت کالی پرچھائیں۔ اور کالی پرچھائیں کے سائے میں راستہ پھر تاریکی میں ڈھل گیا۔

اور گلی؟ گلی پھر کالی کلوٹی رات میں گم ہو گئی۔